کورس کوڈ: 9012

بی ایس اُردو

اردو غزل کا فکری و فنی مطالعہ



شعبۂ اُردو

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

اردو غزل کا فکری و فنی مطالعہ

کورس: بی ایس اُردو　　　کوڈ نمبر: 9012　　　یونٹ 1-9

شعبۂ اُردو

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کورس ٹیم

چیئرمین   پروفیسر ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر

مجلسِ تحریر:

ڈاکٹر محمود الرحمٰن

ڈاکٹر محمد قاسم

نظرِ ثانی: پروفیسر ڈاکٹر محمد کامران (پنجاب یونیورسٹی)

رابطہ کار: ڈاکٹر محمد قاسم

کورس کا تعارف

عزیز طلبہ و طالبات!

بی ایس اردو کے پانچویں سمسٹر کے کورس ''اردو غزل کا فکری و فنی مطالعہ'' میں داخلہ لینے پر ہم علامہ اقبال اوپن اسلام آباد کی جانب سے آپ کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

غزل اردو شاعری کی منفرد اور مقبول ترین صنف سخن میں شمار ہوتی ہے۔ اس کی مقبولیت کا راز اس کے ہمہ گیر موضوعات علائم، اشاروں اور استعاروں میں مضمر ہے۔ اس صنف نے ہر دور میں ہمارے فکری، جذباتی، جمالیاتی، سماجی، تہذیبی اقدار اور رویوں کی نمائندگی کرنے کی بھرپور مساعی کی ہے۔ ہماری تہذیبی و سماجی تاریخ کی ان گنت جھلکیاں اور مرقعوں کی صورت گری غزل میں دکھائی دیتی ہے۔ لہذا غزل محض حسن و عشق کے تذکرے کا نام نہیں بلکہ زندگی کے تمام رنگوں سے ترتیب پاتا ایک ایسا منظر نامہ ہے جس کے ہر منظر میں انسان اور اس کی داستان مضمر ہے۔

اردو غزل کا فکری و فنی مطالعہ نو یونٹوں پر مشتمل ہے جس میں کلاسیکی عہد کے غزل کے علاوہ جدید غزل اور اس کے نمائندہ ترین شعرا کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ کلاسیکی شعرا میں ولی، میر، آتش، مومن جب کہ حالی، حسرت موہانی، فراق اور ناصر کاظمی کی سوانح و غزلیات کا مطالعہ آپ جدید شعرا کے تناظر میں کریں گے۔ اردو شاعری کی مقبول ترین صنف سخن نے تاریخی طور پر جو مداراج طے کیے ان کا احاطہ اولین باب میں کیا گیا ہے۔ قدیم و جدید غزل کے ان نمائندہ ترین شعرا کے کلام کے فکری و فنی پہلوؤں کو نمایاں کرنے کے ساتھ ساتھ شامل نصاب غزلیات کی شرح بھی کی گئی ہے۔ مجوزہ کلیات اور کتب سے بھرپور استفادے کے بعد ہی آپ غزل کی تاریخ اور شعرا کی تفہیم و تعبیر بہتر انداز میں کر سکتے ہیں۔ یہ کورس آپ کے لیے ایک راہ نما کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس پر کامل انحصار کسی صورت بھی مناسب نہیں۔ مجوزہ کلیات و کتب اور رسائل تک رسائی اور ان کے مطالعات کے بعد ہی آپ کے ذوق اور علم و فضل میں اضافہ ہو سکے گا اور امتحانی مشقوں اور امتحانی سوالات کے جوابات کی بہتر مشق ہو سکے گی۔

ڈاکٹر محمد قاسم

اسسٹنٹ پروفیسر

(کورس رابطہ کار)

کورس کے مقاصد

زیرِنظر کورس میں شامل اجزا اور مجوزہ کتب سے بھرپور استفادے کی صورت میں آپ اس لائق ہوسکیں گے کہ:

1۔ اردو شاعری کی منفرد اور مقبول صنف نے تاریخی طور پر جو مدارج طے کیے ان کی تفہیم کرسکیں۔

2۔ غزل کے اشارات اور رموز و علائم کو سمجھ سکیں۔

3۔ کلاسیکی و جدید غزل کے مابین فرق کرسکیں۔

4۔ نصاب میں شامل غزلیات کو بہتر انداز میں سمجھ سکیں۔

5۔ اردو غزل کی تاریخ میں نمائندہ شعرا کے امتیازات سے واقف ہوسکیں۔

6۔ تحسین شعر و شاعری بالخصوص غزل کا نکھرا ہوا ذوق پیدا کرسکیں۔

فہرست ابواب

یونٹ نمبر 1

اُردو غزل کی روایت

تحریر: ڈاکٹر محمد قاسم
نظرِ ثانی: پروفیسر ڈاکٹر محمد کامران

فہرست

یونٹ کا تعارف

غزل اردو شاعری کی منفرد اور محبوب ترین صنف سخن ہے۔ اس کی بے پناہ مقبولیت کا راز اس کے ہمہ گیر موضوعات، رموز وعلائم، اشارات اور استعارات میں مضمر ہے۔ غزل نے ہر دور میں ہمارے فکری جمالیاتی اور تہذیبی رویوں کی ترجمانی کی ہے۔ بہ طور صنف نظم کے پھیلاؤ اور بیسویں صدی میں غزل مخالف آوازوں کے باوجود غزل کی مرکزیت ختم نہ ہو سکی۔ اس یونٹ میں آپ اردو غزل کی صدیوں پر محیط روایت کا مطالعہ کریں گے اور یہ بھی دیکھیں گے کہ اس سفر کے دوران اردو غزل کن کن مراحل سے گزری اور اس میں فکری و موضوعاتی سطح پر کس قدر تنوع پیدا ہوا۔

یونٹ کے مقاصد

زیر نظر یونٹ کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو سکیں گے کہ:

1۔ اردو غزل کی روایت سے آگاہ ہو سکیں گے۔

2۔ غزل نے تاریخی طور پر جو مدارج طے کیے انھیں بیان کر سکیں گے۔

3۔ قدیم و جدید غزل میں امتیاز کر سکیں گے۔

4۔ اردو غزل میں موضوعاتی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں کو بیان کر سکیں۔

5۔ اردو غزل کی روایت کے نمائندہ شعرا کے رنگ سخن سے آشنا ہو سکیں۔

اُردوغزل کی روایت

مثنوی، قصیدہ اور مرثیہ کی طرح اُردوغزل کی ابتدائی نشو ونما دَکن میں ہوئی۔ بہمنی سلطنت کے معرض وجود میں آنے سے لے کر عادل وقطب شاہی دور تک غزل کی روایت مثنوی کے مقابل رفتہ رفتہ نمایاں ہوتی جاتی ہے۔غزل کی اس روایت میں ابتداً مقامی عناصر کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے لیکن رفتہ رفتہ فارسی غزل سے استفادے کی صورت غالب ہوتی چلی جاتی ہے اور شعرا فارسی غزل کو سامنے رکھ کر اُردوغزل کی صورت گری میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔فارسی اُسلوب کے اثر کا انداز اُردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کے کلیات سے لگایا جاسکتا ہے۔اسی طرح یہی رویہ ہمیں غواصی کے ہاں بھی کارفرما دکھائی دیتا ہے۔قلی قطب شاہ اور غواصی جو پہلے مقامی روایت کے زیر اثر عورت کی زبان سے اظہارِ عشق اور مقامی تشبیہات کے استعمال میں منفرد تھے۔اب ان کے فارسی لہجہ واُسلوب دکھائی دیتا ہے:

پیا باج پیالہ پیا جائے نا
پیا باج اک پل جیا جائے نا

(قلی قطب شاہ)

کہتے ہیں پیا باج صبوری کروں
کہا جائے جاناں کیا جائے نا

(غواصی)

یوسف گم سم بھر آ گا اب یہ کنعاں غم نہ کھا
گھر ترا اُمید کا ہوگا گلستاں غم نہ کھا

(قلی قطب شاہ)

کھلے سر تھے گلزار الحمد للہ
اُٹھیا جگ میں مہکار الحمد للہ

(غواصی)

عشق کی آگ میں جل کے راک ہونا
عشق بازی میں چاک چاک ہونا

(غواصی)

اس دور کی غزل موضوعات، تشبیہات واستعارات کے استعمال میں فارسی غزل کے بہت قریب دکھائی دیتی ہے۔ لیکن اس کے پہلو بہ پہلو جذبات کے اظہار، عورت کے حسن، اس کی چال ڈھال اور سراپا نگاری کا بھی بہت واضح اظہار دکن

کی غزل میں نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔

اس عہد کا سب سے بڑا شاعر ولی دکنی ہے۔ ولی سے قبل اُردو غزل کی روایت اس قدر توانا نہ تھی جتنی کہ ولی کے بعد دکھائی دیتی ہے۔ دکنی غزل کا نقطۂ عروج ولی کی غزل ہے۔ ولی کی غزل لسانی و رتہذیبی سطح پر شمال اور جنوب کے درمیان ایک اتصالی نقطہ کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ غزل کے اس تشکیلی دور میں بہ طور صنف اس کے حسن، تاثر پذیری، وسعت اور معیار بندی کے لیے ولی کی خدمات نا قابلِ فراموش ہیں۔

۱۷۰۰ء میں ولی کا دلی آنا اور بعد ازاں ۱۷۲۰ء دیوانِ ولی کا دلی پہنچنا۔ اُردو کی اَدبی تاریخ کے اہم واقعات ہیں۔ دہلوی شعرا کا ولی دکنی اور اس کی شاعری سے متاثر ہونا اور بعد ازاں فارسی کی بجائے اُردو میں غزل کہنا ایک غیر معمولی بات ہے۔ یہاں سے اُردو کی غزل کی ایک با قاعدہ مستحکم ہوتی ہوئی روایت دکھائی دیتی ہے۔ جس نے ولی کو مرجع شعرا بنایا اور ''نقاشِ اول'' کی حیثیت عطا کی۔

ولی کے ہاں دیگر دکنی شعرا کی نسبت فارسی روایت سے زیادہ اکتساب کی صورت دکھائی دیتی ہے۔ ولی نے اپنی غزل کو جس طرح فارسی تراکیب اور لب و لہجے سے آراستہ کیا تو غزل میں دکن کا نسوانی لب ولہجہ اور عورتوں کی جانب سے اظہارِ عشق والا چلن معدوم ہوتا گیا اور غزل مردانہ اور داخلی جذبات اور احساسات کی طرف پیش قدمی کرتی محسوس ہوتی ہے:

دیکھنا ہر صبح تجھ رخسار کا
ہے مطالعہ مطلع انوار کا

دیکھ اے اہلِ نظر سبزہ خط میں لب لعل
رنگ یا قوت چھپا ہے خط ریحان میں آ

آہ پر آہ کھینچتا تھا میں
آج کی رین کچھ حساب نہ تھا
تجھ لب کی صفت لعلِ بدخشاں سوں کہوں گا
جادو ہیں تیرے نین غزالاں سوں کہوں گا

جسے عشق کا تیر کاری لگے
اسے کیوں نہ زندگی بھاری لگے

مفلسی سب بہار کھوتی ہے
مرد کا اعتبار کھوتی ہے

مسندِ گل منزلِ شبنم ہوئی
دیکھ رتبہ دیدہ بیدار کا

شمالی ہند میں ولی کے زیر اثر جو غزل پروان چڑھی، اس میں صنعت ایہام بھی نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہے۔ دہلی کے شعرا نے ولی کی شاعری سے متاثر ہو کر طرزِ ایہام کی بہت کشش محسوس کی۔ رفتہ رفتہ یہ رنگِ سخن اس قدر مقبول ہوا کہ اس دور کا ہر چھوٹا بڑا شاعر ایہام گوئی کی طرف راغب دکھائی دیتا ہے۔ صنعت ایہام اور ایہام گوئی کو باقاعدہ ایک تحریک کی صورت محمد شاہی عہد کے سیاسی، سماجی، تہذیبی و معاشرتی حالات نے عطا کی۔ اس معاشرے کے چھوٹے بڑے تمام طبقات، ہمہ وقت محفل آرائیوں میلوں ٹھیلوں اور رنگ رلیوں میں اپنا وقت گزارتے نظر آتے ہیں۔ امرد پرستی بھی اس عہد میں اپنے عروج کے نقطہ کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

چناں چہ اس دور کی شاعری کا مزاج داخلی یا انفرادی ہونے کے بجائے خارجی رنگ رکھتا ہے اور اس میں مجلسی انداز کا فرما دکھائی دیتا ہے۔ ایسے ماحول میں شاعری بھی تفریح محض سمجھی گئی اور اس کی بنیاد لفظی بازی گری پر رکھی۔ ایہام کا مطلب ہے وہم میں ڈالنا، شک میں ڈالنا۔ ایہام گو شعرا اس بات کا التزام روا رکھتے تھے کہ شعر میں ایک معنی قریب رہا اور دوسرا بعد کا۔ فوری طور پر ایک معانی سمجھ میں آئیں۔ جب کہ غور و فکر کرنے پر دوسرے معانی و مفہوم تک رسائی ممکن ہو۔ چناں چہ شاعری کے نام پر یہی رویہ اس دور کی غزل میں کارفرما نظر آتا ہے۔ اس دور میں شاہ مبارک آبرو، محمد شاکر ناجی، شاہ حاتم، شرف الدین مضمون، آرزو، مصطفیٰ خان یک رنگ، احسن اللہ احسن وغیرہ کی غزل ایہام گوئی کا مرقع دکھائی دیتی ہے۔

خوباں کو جانتا تھا گرمی کریں گے مجھ سوں
دل سرد ہو گیا ہے جب سے پڑا ہے پالا

(آبرو)

دریا عرق میں ڈوبا تجھ سیم تن کے آگے
موتی نے کان پکڑے تیرے سخن کے آگے

(آرزو)

گر سلیماں کا تخت دیں مت کے
کہ سب آخر کوں جائے گا برباد

(ناجی)

لام نستعلیق کا ہے اس بت کافر کی زلف
ہم تو کافر ہوں اگر بندے نہ ہوں اسلام کے

(مضمون)

صبا کہیو اگر جاوے ہے تو اس شوخ دلبر سوں
کہ کر کے قول پرسوں کا گئے برسوں ہوئے
برسوں

(احسن)

خداوندا اُٹھادے درمیاں سے ہجر کے پردے
ہمارے دام میں صیاد کو لا یا ہمیں پردے

(آبرو)

ایہام گوئی کا یہ چلن دلی پر نادر شاہی حملے تک جاری رہا۔ دلی کا اُجڑنا، لوگوں کا ہزاروں کی تعداد میں قتلِ عام اور دلی کے گلی کوچوں، نالہ شیون اور ماتم کی صدائیں، محمد شاہی عہد کی عیش کوشی کی فضا کو اُردو شاعری رخصت کرتی ہیں۔ ماحول کے بدلنے پر غزل کی فضا بھی بدلتی دکھائی دیتی ہے۔ مرزا مظہر جان جاناں ایہام گوئی پر تاثیر شاعری کی طرف مائل کرتے ہیں۔ اس تحریک میں مظہر جانِ جاناں کے پہلو بہ پہلو باقر، فغاں، شاہ حاتم پیش پیش دکھائی دیتے ہیں۔ اس دور شاہ حاتم ''دیوانِ حاتم'' مسترد کر کے اپنا کلام نئے سرے سے ''دیوان زادہ'' کے نام سے ترتیب دیا اور یوں اُردو شاعری کے تاریخ میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ کلاسیکل اُردو غزل کی نشو ونما اس عہد میں دکھائی دیتی ہے۔ میر، سودا اور درد نے غزل کو کمال درجے تک پہنچایا۔ اس دور کی غزل میں فارسی روایت اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہے۔ فارسی غزل کے اعلیٰ معیارات تک رسائی حاصل کرتے ہوئے ان شرانے اپنی انفرادیت و امتیاز قائم کرنا ہت ہی غیر معمولی بات ہے۔ فارسی شاعری کے موضوعات مثلاً تصوف، واردات، عشق، اخلاقیات، خمریات، رند و درویشی اور حیات و کائنات کے مسائل اُدو شاعری کے تصوف میں آ گئے۔ رمز، اشارات، علامات و تلمیحات، تشبیہات و استعارات، تراکیب اور فارسی لب و لہجے کا اُردو شاعری میں سرایت کرنا جانا بجائے خود غیر معمولی واقعہ ہے۔ یوں میر و سودا اگلے دور کے شعرانے اپنی اخلاقانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے حیرت انگیز طور پر قلیل مدت میں اُردو غزل کو فارسی کے اعلیٰ معیار کے مقابل کھڑا کر دیا ہے اور اس میں وہ توانائی اور قوت بھر دی ہے۔ جو اس سے پہلے کی غزل میں مفقود و معدوم معلوم ہوتی ہے۔ مایوسی، بے چینی، غم والم، بے یقینی، پژمردگی اور دنیا کی بے ثباتی اس عہد کی غزل کے اہم ترین اجزا ہیں۔ مجاز کے پردے میں حقیقت کا بیان اور حقائق تک پہنچنے کی کوشش اس عہد زریں کی غزل کا خاصہ ہے۔ دلی شہر کی تہذیب و ثقافت کی بربادی، افراتفری، انتشار اور انسان کی بے توقیری کے جیتے جاگتے مرقعوں سے میر و سودا کے عہد کی غزل مملو دکھائی دیتی ہے۔

خدائے سخن میری ترقی میر اس عہد کے سب سے بڑے غزل گو شاعر ہیں۔ سودا، غالب، آتش، ذوق، حالی، حسرت، فراق، ناصر......کون ہے جو معتقد میر نہیں؟ میر تقی میر نے غزل کے امکانات کو وسیع تر کرنے کی جو کوشش کی وہ محض انہی کا خاصہ ہے۔ میر کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف اُردو کے تمام بڑے شعرا نے کیا ہے لیکن یہ الگ بات کہ میر کا انداز کسی کو کم ہی نصیب ہوا ہو۔ میر کی شاعری اپنے عہد کی آئینہ دار ہے۔ میر کی شاعری میں آشوبِ ذات کے ساتھ ساتھ آشوبِ زمانہ کے پرتو بھی دکھائی دیتے ہیں۔ میر نے غزل کو واردات قلبی سے ہم آہنگ کرتے ہوئے انسانی جذبات ونفسیات کے ایسے مرقعے کھینچے ہیں جو ان کے معاصرین میں کسی دوسرے شاعر کے ہاں دکھائی نہیں دیتے۔ میر کی شاعری میں ذاتی خرماں نصیبی اپنے عہد کی سیاسی بد حالی، معاشرتی ابتری اور زندگی کی نا پائیداری میر کی حساس طبیعت سے آمیز ہو کر جس طرح جلوہ نما ہوتی ہے۔ وہ اپنی مثال آپ ہے۔ میر نے اپنی ہمہ جہت شخصیت سے اُردو غزل غزل کو وہ رنگ آہنگ عطا کیا جس کی چھوٹ دور تک غزل پر دکھائی دیت ہے:

اب جہاں آفتاب میں ہم ہیں
یاں کبھو سرو گل کے سائے تھے

دل مجھے اس گلی میں لے جا کر
اور بھی خاک میں ملا لایا

تیرے فراق میں جیسے خیال مفلس کا
گئی ہے فکر پریشاں کہاں کہاں میری

مصائب اور تھے پر جی کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

دلی کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

میر جنگل پڑے ہیں آج جہاں
لوگ کیا کیا یہیں تھے کل بیٹھے

پھرتے میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

اس عہد میں مرزا محمد رفیع سودا بھی دکھائی دیتے ہیں۔مرزا سودا نے تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی اور اپنی شاعرانہ عظمت کا لوہا منوایا۔سودا بنیادی طور پر قصیدے اور ہجو کے شاعر تھے۔ان کی خلاقی کے جوہر جس طرح ان اصنافِ سخن میں کھلتے ہیں،وہ دیدنی ہے۔سودا کی غزل میں سادگی،سوز وگداز اور تغزل کے فقدان کی طرف جو اشارہ کیا جاتا ہے۔وہ میر تقی میر کی غزل سے تقابل کا نتیجہ ہے۔سودا کا مزاج میر سے مختلف تھا۔اس لیے لامحالہ ان کی غزل بھی میر کی غزل سے مختلف ہے۔مرزا سودا غزل میں کبھی کسی سے کم نہیں۔ان کی غزل میں ان کی شخصیت کا ہر رنگ،ہر احساس اور تجربہ جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔مضامین کی بوقلمونی،وسعتِ نظری،بیان کی ندرت،نشاطیہ آہنگ کے باعث سودا کی غزل ایک امتیازی وانفرادی حیثیت رکھتی ہے۔سودا کے ہاں عربی وفارسی تراکیب کا چلن زیادہ دکھائی دیتا ہے۔جب کہ ہندی الفاظ کا استعمال سے ایک گریز کی صورت نظر آتی ہے۔فارسی وعربی کی اسی آمیزش کی بدولت اُردو شاعری گہرائی،لطافت اور وسعت سے ہم کنار نظر آتی ہے۔سودا کی غزل زندگی کی تمام تر رنگارنگی اور تنوع کی آئینہ دار ہے،جس میں سودا کا مزاج اپنی پوری توانائی کے ساتھ جابہ جا جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔خارجیت اور تمثیل نگاری کے ساتھ ساتھ معاشی،معاشرتی اور سیاسی بدحالی کا مذکور بھی سودا کے ہاں اپنے طور سے نمایاں ہے۔

سودا کے خیالات میں جھمکے ہے خدائی
جو اپنے تخیل میں چاہے سو وہی ہو

اس مرغ ناتواں کی صیاد کچھ خبر ہے
جو چھوٹ کر قفس سے گلزار تک نہ پہنچا

فکرِ معاش، عشق ِ بتاں ، یادِ رفتگاں
دو دن کی زندگی میں بھلا کیا کرے کوئی

اس گلشن ہستی کی عجب دید ہے لیکن
جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم تھا خزاں کا

عاشق کی بھی کٹتی ہیں کیا خوب طرح راتیں
دو چار گھڑی رونا دو چار گھڑی باتیں

سودا جو ترا حال ہے ایسا تو نہیں وہ
کیا جانیے تو نے اسے کس آن دیکھا

نے بلبل چمن نہ گل نو دمیدہ ہوں
میں موسم بہار میں شاخ بریدہ ہوں

دل کے ٹکڑوں کو بغل بیچ لیے پھرتا ہوں
کچھ علاج ان کا بھی اے شیشہ گراں ہے کہ نہیں

خواجہ میر درد اپنے منفرد شعری اسلوب اور جداگانہ اندازِ فکر کی بدولت اس عہد بلکہ ہر عہد میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔اُردو میں صوفیانہ شاعری کا باقاعدہ آغاز میر درد کی بدولت ہوا۔اپنے عہد کی شکست وریخت کے اثرات بجا طور پر درد کی شاعری میں محسوس کیے جا سکتے ہیں۔دُنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری کا احساس ان کے کلام میں جا بجا اپنی جھلک دکھاتا ہے۔میر درد نے صوفیانہ خیالات کو انسانی محبت اور دنیا کی ناپائیداری کے تناظر میں کچھ اس طرح برتا ہے کہ یہ محض انہی کا حصہ بن کے رہ گیا ہے۔درد کے علاوہ اس عہد میں کوئی ایسا شاعر دکھائی نہیں دیتا جس نے تصوف اور صوفیانہ خیالات ہی کو اپنی غزل کا بنیادی موضوع بنایا ہو۔درد اُردو غزل میں تصوف و معرفت کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔عشق ان کے ہاں ایک بنیادی جذبہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ان کی غزل میں عشق مجازی اور عشقِ حقیقی دونوں کی صورت گری بہت نمایاں ہے۔کائنات کے اسرار ورموز تک رسائی کی کوشش بھی ان کے دکھائی دیتی ہے۔

قتل عاشق کسی معشوق سے کچھ درر نہ تھا
پر ترے عہد کے آگے تو یہ دستور نہ تھا

حیرت آئینہ وار ہیں ہم
کس سے یارب دو چار ہیں ہم

ہر آن ہے واردات دل پر
آتا ہے یہ قافلہ کہاں سے

ارضِ و سما کہاں تیری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ جہاں تو سما سکے

ہر شام مثل شام ہوں میں تیرہ روز گار
ہر صبح مثل صبح گریباں دریدہ ہوں

کیا فرق داغ وگل میں اگر گل میں بو نہ ہو
کس کام کا وہ دل جس دل میں تو نہ ہو

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

جوش جنوں کے ہاتھ سے فصل بہار میں
گل سے بھی ہوسکی نہ گریباں کی احتیاط

نادرشاہ کے حملے سے ابھی اہلِ دلی سنبھل ہی نہ پائے تھے کہ احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں کی قتل و غارت گری سے لاکھوں افراد اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ سیاسی، سماجی، اور معاشرتی، سطح پر ایسے دل دہلا دینے والے واقعات نے معاشرتی اور تمدنی زندگی کو بری طرح متاثر کیا۔ افلاس، بدامنی، انتشار اور بے اطمینانی نے ہر طرف ڈیرے جما لیے۔ اقتصادی بدحالی کے ساتھ ساتھ جان، مال، آبرو بچانا بھی دشوار ہو گیا۔ ایسے حالات میں جس نے جہاں کا رخ کیا وہ وہیں کا ہو کر رہ گیا۔ رفتہ رفتہ دہلی اجڑنے لگی اور دیگر لوگوں کی طرح شعرائے دہلی بھی تلاشِ معاش کی خاطر ہجرت کر کے لکھنو آ گئے۔

میر،سودا،میر حسن، مصحفی ،انشا، جرات ،رنگین لکھنو آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گے۔ رفتہ رفتہ یہاں نئے طرزِ سخن کا آغاز ہوا۔ جسے اَدبی تاریخ میں دبستانِ لکھنو سے موسوم کیا گیا۔ دہلی میں انتشار، بربادی اور افراتفری تھی جب کہ لکھنو امن ،سکون اور خوش حالی اور فارغ البالی کا مرکز تھا۔لکھنو کی فضا میں عیش کوشی ، رنگ رلیاں ،کھیل تماشے، میلے ٹھیلے کا عنصر بہت نمایاں تھا۔ چناں چہ آہستہ آہستہ شاعری پر بھی یہی رنگ چڑھنے لگا۔ درباری رنگ رلیاں ام معاشرتی زندگی پر اثر انداز ہوتی گئیں اور یوں شاعری کا رخ دروں بینی کے بجائے خارجیت کی طرف مائل ہو گیا۔ چناں چہ لکھنوی فضا کی شاعری میں ہجر وفراق اور عشاق کے تارے گننے کی واردات کا تذکرہ نہیں ملتا۔ یہاں وصال اور محض وصال ہی کی کیفیات کا بیان ہے۔

شعرانے بھی جب داخل سے نکل کر خارج کا سفر کیا تو محبوب کی ذات اور سراپا نگاری کا بیان ہی ان کا محبوب مشغلہ ٹھہرا اور یوں ظاہری حسن ، چال ڈھال ، زیورات ، سامانِ آرائش ، معاملہ بندی اور رکیک جذبات کا بیان ہی لکھنوی غزل کے انفرادی رنگ کے طور پر نمایاں ہوا۔ خارجیت پسندی کے اس رجحان کے باعث غزل گوئی کا اسلوب پر تکلف اور حد درجہ پر تصنع ہو گیا۔

غزل کی روایت میر وسودا سے ہوتی ہوئی مصحفی ، جرات ،انشا اور رنگین تک پہنچتی ہے۔ مصحفی کے علاوہ مذکورہ تمام شعرا غزل میں کوئی بڑا کارنامہ سرانجام نہ دے سکے۔اس عہد کے سب سے باصلاحت شاعر مصحفی تھے۔ مصحفی نے لکھنو کے بدلتے ہوئے ادبی منظر نامے میں اپنی شناخت بہر حال قائم رکھی اور دلی کا لب ولہجہ ان کی غزل میں اپنا رنگ جمائے رکھتا ہے۔ خارج کے تجربات کی پیش کش میں بھی مصحفی کا ابتدائی شعری پسِ منظر جا بہ جا جھلکتا محسوس ہوتا ہے۔ مصحفی کی شاعری میں رنگ و بو کا احساس ،لمس اور حسیاتی کیفیات کا بیان جس انداز میں ملتا ہے وہ انھی کا حصہ ہے اور انھی اوصاف کی بنا پر وہ اپنے معاصرین میں ایک منفرد مقام رکھتے تھے۔

حادثے ہوتے تھے زمانے میں
اس قدر انقلاب کس دن تھا
مصحفی آج تو قیامت ہے
دل کو یہ اضطراب کس دن تھا

خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا
ہجر تھا یا وصال تھا کیا تھا
مصحفی شب جو چپ تو بیٹھا تھا
کیا تجھے کچھ ملال تھا کیا تھا

بھیگے سے تیرا رنگ حنا اور بھی چمکا
پانی میں نگاریں کفِ پا اور بھی چمکا
جوں جوں کہ پڑیں منہ پہ ترے مینہ کی بوندیں
جوں لالہ تر حسن ترا اور بھی چمکا

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم
تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

حسرت پہ اس مسافر بے کس کی رویئے
جو تھک کے بیٹھ جاتا ہے منزل کے سامنے

چلی بھی جاجرس غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلہ نو بہار ٹھہرے گا

انشا بڑے قادر الکلام شاعر تھے۔لکھنو اور لکھنوی معاشرت کا جتنا گہرا تاثر انشا کی شاعری میں ملتا ہے اور کسی کے ہاں کم ہی ملے گا۔انشا کی استادی اور قادر الکلامی اپنی جگہ مسلم الثبوت ہے لیکن وہ غزل کے مزاج کے شاعر نہ تھے۔انشا کے مزاج وطبیعت میں ٹھٹھول، پھکڑ پن، طعن وتمسخر اور ہنگامہ آرائی جیسی صفات تھیں اور وہی کم وبیش عملی طور پر ان کی غزل میں بہت کثرت سے جلوہ نما ہیں۔انشا اپنی طبیعت کے تمام تر غیر سنجیدہ رویوں کے ساتھ غزل آرا ہے۔غزل جس تہذیب اور متانت کی متقاضی ہے وہ انشا کی شخصیت سے بہت دور کی بات تھی۔ چنانچہ ان کی غزل کا اپنا ایک منفرد مذاق رکھتی ہے جو انہی سے عبارت ہے۔ریختی کی شکل میں اُردو غزل کی عجیب وغریب قسم کی توسیع میں انشا کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔انشا کے ہاں بول چال اور مکالمے کا انداز بہت نمایاں ہے:

دیوار پھاندنے میں دیکھو گے کام میرا
جب دھم سے آ کہوں گا صاحب سلام میرا

کھوے جب چاند سے اس مکھڑے کا گھونگھٹ عاشق
کیوں نہ پھر لیوے بلائیں تری چٹ پٹ عاشق

نہیں معلوم جی تم نے یہ کیا پڑھ پھونکا
کہ تمہیں دیکھتے ہی ہو گئے ہم جھٹ عاشق

میں جو شب ان سے راہ میں لپٹا
نیم حاکم رہا نہ خوف عس

موج بہار لالہ خود رو نے اے نسیم
کچھ آگ سی لگائی ہے کہسار پر

کہاں گردشِ فلک کی چین دیتی ہے سنا انشا
غنیمت ہے کہ ہم صورت یاں دو چار بیٹھے ہیں

مصحفی اور انشا کے بعد اس دور کا اہم شاعر جرات ہے۔قلندر بخش جرات کی غزل میں شوخی، بانکپن،،معاملہ بندی، کے پہلو بہ پہلو ہجر وفراق اور بے چینی کا عنصر بھی دکھائی دیتا ہے۔معاملہ بندی جرات کی شاعری کا بنیادی وصف ہے۔وصل اور وصل کی لذت کا بیان ان کے ہاں ابتذال اور رکاکت کی حدوں کو چھولیتا ہے۔

رہے تھاہم سے ہم آغوش جب کہ وہ پیارا
عجب مزے کی تھیں راتیں عجب تھے پیارے دن

لگ جا گلے سے تاب اب اے نازنیں نہیں
ہے ہے خدا کے واسطے کر نہیں نہیں

سرسری ان سے ملاقات ہے گاہے گاہے
صحبت غیر میں گاہے سر راہے گاہے

یاد آتا ہے تو کیا پھرتا ہوں گھبرایا ہوا
چمپئی رنگ اس کا اور جوبن گدرایا ہوا

مدت کے بعد کیا کہوں گھر مرے آیا تو
کچھ کہہ کان میں کوئی بد ذات لے گیا

جنوں عشق سے یہ حال ہے اپنا کہ ہم وحشی
کبھی نہیں دے کے روتے ہیں کبھی رودے کے ہنستے ہیں

شیخ امام بخش ناسخ طرزِ لکھنو کے موجد، قادرالکلام اور مسلم الثبوت استاد شاعر تھے۔جن کو اُردو، عربی اور فارسی زبانوں پر کامل قدرت حاصل تھی۔اَدبی منظر نامے پر مصحفی، انشا اور جرات کی موجودگی میں خیال واسلوب کی سطح پر ایک نیا رنگِ سخن متعارف کروانا ایک غیر معمولی بات تھی۔ناسخ کا سب سے اہم کارنامہ اُردو غزل میں اصلاح زبان کا ہے۔

ضابطے، قاعدے اور معیار بندی کی طرف ناسخ نے جس شدت سے عمل کیا۔اس کا اُردو زبان کو بہت فائدہ ہوا۔ناسخ کی غزل میں خیال پسندی، مضمون آفرینی، صناعی، نادر الفاظ وتشبیہات تو ملتی ہیں مگر جذبات کی تاثیر نہیں ملتی۔خارجی رنگ کے باعث ان کی غزل میں جذبہ واحساس کی سطح بری طرح مجروح ہوجاتی ہے۔ان کا کلام زلف وکاکل اور چشم وابرو کا مضمون ہوکر رہ جاتا ہے۔ناسخ کی شاعری میں فکری گہرائی کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔مگر زبان وبیان کے لحاظ سے ان کی شاعری اہم ہے۔زبان کے حوالے سے ان کے اشعار سند کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں:

دیکھ اپنے روئے آتش ناک کی تصویر کو
تیرے نقشے نے جلایا کاغذِ تصویر کو

میٹھی نظروں سے وہ کیا دیکھے مجھے
ہے پری کی آنکھ میں بادام تلخ

یہ نازکی کے ہیں معنی کہ باغ میں وہ گل
قریب آتش گل جب گیا بخار آیا

شعلہ رخسار جاناں نے لگائی ہے جو آگ
ماہ تاباں آج مہتابی ہے آتش باز کی

روئے جاناں کا تصور میں جو نظارہ ہوا
دل میں تھا جو داغِ حسرت عرش کا تارا ہوا

آتش مرصع ساز کی غزل دبستان لکھنو کے دیگر شعرا سے منفرد وممتاز ہے۔ان کی شاعری میں دیگر لکھنوی شعرا کی طرح ابتذال کے بجائے ایک ٹھہراؤ اور توازن کی کیفیت ہے۔آتش کی شاعری میں رجائیت کا پہلو بہت نمایان ہے۔وہ زندگی سے مایوس نہیں ہوتے۔ بلکہ اس کے عطا کردہ مصائب کواجاگر کرتے ہیں۔اپنے قلندرانہ مزاج کے باعث بوریے پہ بیٹھنا ان کے لیے باعث شرف ہے۔آتش کی غزل میں داخلیت وخارجیت کا حسین امتزاج ملتا ہے۔آتش نے اپنی ذات کے تناظر میں خارجی ماحول کی بہت عمدہ عکاسی کی ہے۔توکل،تصوف اور قناعت کے رنگ ان کی غزل میں نمایاں ہیں۔ تکلف،تصنع سے ان کا کلام عیب دار نہیں۔

آئینہ سینہ صاحب نظراں ہے کہ جو تھا
چہرہ شاید مقصود عیاں ہے کہ جو تھا

چھوڑ کر ہم نے امیری کی فقیری اختیار
بوریئے پہ بیٹھے ہیں قالیں کو ٹھوکر مار کر

وحشی تھے بوئے گل کی طرح سے جہاں میں ہم
نکلے تو پھر کے آئے نہ اپنے مکاں میں ہم

سر شمع ساں کٹائیے پر دم نہ ماریئے
منزل ہزار سخت ہو ہمت نہ ہاریئے

نہ پوچھ حال مرا چوب خشک صحرا ہوں
لگا کے آگ مجھے کارواں روانہ ہوا

کوچہ دلبر میں ، میں بلبلِ چمن میں مست ہے
ہر کوئی یاں اپنے اپنے پیراہن میں مست ہے

بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرہ تو اک قطرہ خوں نہ نکلا

لکھنو کے متوازی اکبر آباد میں نظیر بھی اُردو شاعری کا ایک روشن نام ہے۔جس سے بہر حال اغماض نہیں برتا جاسکتا۔نظیر بنیادی طور پر ایک نظم گو شاعر کی حیثیت سے معروف ہیں۔لیکن ان کی غزل بھی بڑی حد تک قابلِ توجہ ہے اور وہ غزل گوئی میں بھی ایک درجہ انفرادیت رکھتے ہیں۔نظیر نے زندگی کے حقیقی روپ کو من وعن اپنی شاعری میں برتنے کی شعوری کوشش کی ہے۔نظیر کو شاعری میں خالص ہندوستانی معاشرت دھڑکتی سانس لیتی محسوس ہوتی ہے۔حقیقت ، واقعیت اور جزئیات نگاری کے رنگ ان کی غزل میں بھی اپنی جھلک دکھاتے ہیں۔نظیر کی غزل اپنے معاصرین سے کسی طرح کم نہیں ہے۔تغزل کی چاشنی بھی ان کے ہاں اپنے پورے تاثر کے ساتھ موجود ہے:

کیا کبک کو دکھلاتے ہی انداز خرام آہ
حسرت زدہ شوخی رفتار تو ہم ہیں

ٹھہرنا عشق کے آفات کے صدموں میں نظیر
کام مشکل تھا پر اللہ نے آسان کیا

ملو جو ہم سے تو مل لو کہ ہم بہ نوک گیاہ
مثال قطرہ شبنم رہے رہے نہ رہے

ہزاروں گالیاں دیں پھر ذرا ہنس کر ادھر دیکھا
بھلا اتنی تسلی سے پھپھولے دل کے کب پھوٹے

جو نگہہ سے چاہ کے دیکھو تو چڑھا کے تیوری یہ کہتا ہے
تیری اس نگہہ کی سزا ہے یہ کہ بس اب میں تجھ سے چھپا کروں

میر وسودا کے زمانے کی اُجڑی ہوئی دلی کو بسنے اور استحکام پذیر ہونے میں ایک زمانہ لگا۔احمد شاہ ابدالی کے حملے کے بعد دلی کا امن وسکون غارت ہی رہا اور امن واستحکام کی کیفیت شاہ عالم ثانی کے زمانے میں پیدا ہوئی۔سماجی اور معاشرتی سطح پر زندگی کی رونق بحال ہوئی تو دہلی ایک بار پھر اُردو غزل کا مرکز بن گیا۔لال قلعے میں مشاعرے منعقد ہونے لگے۔ذوق، غالب،مومن،شیفتہ،بہادر شاہ ظفر جیسے شعرا غزل سرا دکھائی دینے لگے۔ان شعرا میں ہر شاعر اپنا اپنا رنگِ سخن

رکھتا ہے۔اُردوغزل کی تاریخ کا یہ نہایت زرخیز زمانہ ہے۔

شیخ محمد ابراہیم ذوق بنیادی طور پر قصیدے کے شاعر تھے۔اردو شاعری میں ان کا رتبہ اور شناخت قصائد کے باعث ہے۔ذوق کی غزل ان کے مخصوص مزاج کی آئینہ دار ہے۔ذوق کی غزل میں روانی،ترنم،فن کاری اور بے ساختگی اپنی جگہ مسلم الثبوت لیکن جذبہ و احساس کی سطح پر ان کی غزل اپنے معاصرین کی طرح بار توجہ نہیں پاتی۔ ذوق کی غزل کا لہجہ سادہ اور عوامی نوعیت کا ہے۔اس شاعری میں نہ ہی معانی و مفاہیم کی سطح پر کوئی پیچیدگی ہے اور نہ ہی اس میں فکر و فلسفے کے مسائل کا کوئی بیان ملتا ہے۔یہ انیسویں صدی کے ایک عام انسان کی نمائندہ شاعری ہے۔جو جذبہ و فکر کی بلندی سے آزاد ہے۔ذوق کی غزل اس تناظر میں ناسخ کی یاد دلاتی ہے۔

مذکور تیری بزم میں کس کا نہیں آتا
پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا

گزرتی عمر ہے یوں دور آسمانی میں
کہ جیسے جائے کوئی کشتی دخانی میں

رند خراب حال کو اے زاہد نہ چھیڑ تو
تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

لائی حیات آئے قضائے چلی چلے
اپنی خوشی آئے نہ اپنی خوشی چلے

کھل کے گل کچھ تو بہار اپنی صبا دکھلا تو گئے
حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گزر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

غالب اس عہد کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔اُردو شعر و سخن کی تاریخ میں غالب جیسا نکتہ سنج،تخیل و فکر، جدتِ بیان،ندرتِ خیال،اور پختہ تہذیبی شعور کی بدولت ایک ایسا نابغہ ہے جس کی دوسری کی کوئی مثال نہیں۔غالب کی

غزل میں عشقیہ، حزنیہ اور گرمئی نشاط کے جذبات اس طرح نظم ہوئے ہیں کہ وہ نہ صرف اپنے عہد کے ترجمان بن گئے ہیں بلکہ زمان ومکان سے ماوراہوکر آنے والے ہر عہد کے انسان کی ذہنی وجذباتی نمائندگی کا وسیلہ بھی بنتے ہیں۔ غالب کی غزل اُردو شاعری کی تمام تر قدیم روایت سے ہٹ کر ایک نیا منظر نامہ پیش کرتی ہے جس کا ہر رنگ منفرد اور جدید ہے۔ فطرت انسان کی غالب کی شاعری کا معتد بہ حصہ فکر وتخیل اور تجربے کی پیداوار ہے۔ زندگی کے ہر عمل میں جہاں ان کے دل کے دھڑکنیں شریک ہیں وہیں ان کا سوچتا ہوا تخیل بھرا ہوا ذہن بھی شریک کار رہتا ہے۔ اپنی ذات سے لے کر کائنات اور موجودات عالم کے اسرار ومسائل پر سوچتا ہوا انسان ان کی غزلوں میں جلوہ نما ہے۔

ہے کائنات کو حرکت تیرے ہی ذوق سے
پرتو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقہ دامِ خیال ہے

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے تو دشت امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغر جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

دام ہر موج میں حلقہ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو پھر جینے کا مزہ کیا

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولا برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں

اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

ہوں گرمی نشاط تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیب گلشن نا فریدہ ہوں

مومن خان مومن بھی اس دور کی غزل کا ایک منفرد اور معتبر نام ہے۔ مومن کی شاعری معاملات حسن وعشق کے بیان کی شاعری ہے اور اسی بنا پر ان کی غزل میں فکر کا عنصر نہیں ملتا۔ اردو کی عشقیہ شاعری میں مومن اپنی ایک خاصی طرز رکھتے ہیں۔ زندگی کا حسن انھیں اپنی جانب کھینچتا ہے اور وہ اس سے حظ بھی اٹھاتے ہیں۔ حسن کی رنگینی، رعنائی، ہجر کا سوز اور وصل سے لطف اندوزی کا بیان بھی ان کی غزل میں اعتدال کے ساتھ نظم ہوا ہے۔ گویا مومن نے غزل کے لغوی مفہوم پر اپنی شاعری کی بنیاد رکھی ہے۔ نازک خیالی مضمون آفرینی، معاملہ بندی اور محاکات نگاری مومن کی غزل کے نمایاں اوصاف ہیں۔ مومن کا عشق ایک انسان کا دوسرے انسان سے عشق ہے۔

تاب نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں
اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہو گے

شب تم جو بزم غیر میں آنکھیں چرا گئے
کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی غمزہ غماز دیکھنا

اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

میرے تغیرِ رنگ کو مت دیکھو
تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے
تم نے اچھا کیا نباہ نہ کیا

بہادر شاہ ظفر کی غزل مخصوص ماحول اور مزاج کی پیداوار ہے۔ اداسی، تنہائی، بے قراری، احساسِ محرومی اور اسیری کے عناصر سے تشکیل پاتی غزل ظفر کی شناخت بنتی ہے۔ بادشاہ ہوتے ہوئے بھی ایک بے اختیاری کی کیفیت اور بعد ازاں اسیری کے معاملے نے ان کی شاعری میں ایک عجیب طرح کی کسک اور حزنیہ کیفیت پیدا کر دی ہے، جو انھی سے مخصوص ہے۔ ان کے ہاں عشق و عاشقی کے روایتی مضامین کے ساتھ ساتھ تصوف کا رنگ بھی دکھائی دیتا ہے جو حالات کے جبر کی نمائندگی کرتا ہے۔ بے تکلفی اور موسیقیت ان کی غزلوں میں نمایاں ہے۔

یا مجھے افسر شاہانہ بنایا ہوتا
یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا
نشہ عشق کا گر ظرف دیا تھا مجھ کو
عمر کا تنگ نہ پیمانہ بنایا ہوتا

جو مجھے لیتا ہے پھر وہ پھیر دیتا ہے مجھے
میں عجب اک جنس ناکارہ خریداروں میں ہوں
خانہ صیاد میں ہوں طائر تصویر وار
پر نہ آزادوں میں ہوں میں نے گرفتاروں میں ہوں

نہیں عشق میں اس کا ہمیں تو رنج کہ قرار و شکیب ذرا رہا
غم عشق تو اپنا رفیق رہا کوئی اور بلا سے رہا نہ رہا

کوئی کیوں کسی کا لبھائے دل کوئی کیا کسی سے لگائے دل
وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

اس کی آنکھوں نے خدا جانے کیا کیا جادو
کہ طبیعت مری مائل کبھی ایسی تو نہ تھی

عہدِ غالب کے بعد اُردو غزل پھر زبان و بیان کی رعنائی کی طرف مائل ہوئی۔ داغ و امیر اور ان کے شاگردان اس میں پیش پیش رہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی پر مغلیہ سلطنت ختم ہو جاتی ہے اور انگریز اقتدار و اختیار کے بلاشرکت غیرے مالک بن گئے۔ دہلی ایک بار پھر اجڑی اور بہادر شاہ ظفر کو جلاوطن کر کے رنگون بھیج دیا گیا۔ اس سے کچھ عرصہ پہلے واجد علی شاہ کلکتہ میں نظر بند کر دیے گئے۔ کیا دلی کیا لکھنو پورا ملک انگریزوں کے تسلط و تصرف میں چلا گیا۔ دلی اور لکھنو کی بربادی کے بعد رام پور، ٹونک اور حیدر آباد کی ریاستوں میں شعرا اور اہلِ علم کو اعزاز و اکرام میسر آتا ہے اور امیر مینائی، داغ، جلال و منیر وغیرہم اس منظر نامے میں دکھائی دیتے ہیں۔ انگریزوں کی ثقافتی یلغار کے سامنے کوئی شے نہیں ٹکتی۔ جغرافیائی حد بندیاں غیر موثر ہو جاتی ہیں۔ دہلی اور لکھنو کی روایتی تفریق رفتہ رفتہ مٹی ہے۔ اور یوں ان شعرا کی غزل میں کلاسیکی انداز نمایاں دکھائی دیتا ہے ان مذکورہ شعرا میں سے داغ کا رنگِ سخن عوام و خواص میں بہت مقبول ہوا۔ داغ اپنے طرز اپنے رنگ کے موجد ٹھہرے۔ داغ کی غزل کا محور عشقیہ تجربات ہیں۔ داغ کی غزل کا سب سے نمایاں وصف اس کا لب و لہجہ ہے۔ گرمی گفتار، شوخی، شگفتہ بیانی، برجستگی، تیکھا پن ان کی غزل کی جان ہے۔ عشقِ مجازی کے تمام لوازم جس بلا کی شوخی کے ساتھ ان کی شاعری میں نظم ہوئے ہیں۔ وہ بہت حد تک حیرت انگیز ہیں۔ محبوب، واعظ اور رقیب سے چھیڑ چھاڑ میں طنز، تمسخر، طعن، شکوہ و شکایت، حاضر جوابی اور برجستگی کے عناصر جس طرز خاص سے داغ کے ہاں دکھائی دیتے ہیں، وہ اُردو شاعری کو ان کی عطائے خاص ہے۔

اک حرف آرزو پہ وہ مجھ سے خفا ہوئے
اتنی سی بات کہہ کے گناہ گار ہو گئے

دل میں سما گئی ہیں قیامت کی شوخیاں
دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں

جلوے مری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں
مجھ سے کہیں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں

تو بھی اے ناصح کسی پہ جان دے
ہاتھ لا استاد کیوں کیسی کہی

پہلے گالی دی سوال وصل پر
پھر ہوا ارشاد کیوں کیسی کہی

غضب کیا تیرا وعدے پہ اعتبار کیا
تمام رات قیامت کا انتظار کیا

امیر مینائی اپنے عہد کے قادرالکلام اور مسلم الثبوت استاد تھے۔ان کی غزل دہلوی اور لکھنوی رنگ کا حسین امتزاج ہے۔حسن وعشق کے معاملات،ہجروفراق کی کیفیات اور تصوف ومعرفت کے اسرار کی جھلک میں امیر کی غزل میں دکھائی دیتی ہے۔سلاست، نازک خیالی،مضمون آفرینی، برجستگی،شوخی ان کے کلام کے نمائندہ اوصاف ہیں۔ان کے ہاں حسن کی مرقع کشی کی صورت بھی بڑے متوازن انداز میں جلوہ گر ہے۔

آنکھیں کھلی ہوئی ہیں عجب خواب ناز ہے
فتنہ تو سو رہا ہے درفتنہ باز ہے

باغباں کلیاں ہوں ہلکے رنگ کی
بھیجنا ہے ایک کم سن کے لیے

اچھے مسیحا ہو مریضوں کا خیال اچھا ہے
ہم مرتے جاتے ہیں تم کہتے ہو کہ حال اچھا ہے

پھنسی جو دام میں بلبل تو کن نگاہوں سے
کبھی چمن کو کبھی سوئے آشیاں دیکھا

یوں ترے در پہ کیوں پڑے رہتے
ہم غریبوں کا گھر اگر ہوتا

قریب ہے یارو روزمحشر چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر
جو چپ رہے گی زبان خنجر تو لہو پکارے گا آستیں کا

پہلو میں میرے دل کو نہ اے درد تلاش کر
مدت ہوئی غریبِ وطن سے نکلا گیا

اُردوغزل پر امیر وداغ کے رنگِ سخن کی گرفت ان کی وفات تک قائم رہی۔ ان کے اندازِ سخن کے متاثرین نے بیسویں صدی کے اوائل کے بعد بھی اسی طرز کی شاعری کی۔ حالات کے جبر اور زمانے کی روش ان پر مطلقا اثر انداز نہ ہوئی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کا ہندوستان سیاسی، سماجی، معاشرتی اور تہذیبی سطح پر ماقبل کے ہندوستان سے یک سر مختلف دکھائی دیتا ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل سے سیاسی اور سماجی تحریکوں کے زیرِ اثر بیداری کی لہر سے شعر وادب بھی متاثر ہوا اور رفتہ رفتہ اس کے اثرات اردو غزل میں بھی نمایاں ہوئے۔

حالی اگرچہ امیر وداغ کے معاصر تھے لیکن ان کا مذاقِ سخن ان سے علیحدہ تھا۔ حالی نے بطور غزل گو شاعری کا آغاز کیا۔ ان کی ابتدائی غزلیات قدیم رنگِ سخن اور مذاقِ شاعری کی پیداوار ہیں۔ آہستہ آہستہ وقت اور حالات کے تناظر میں ان کا مذاقِ سخن بدلا اور ان کی غزل جدید رویوں کی ترجمان بن گئی۔ حالی نے مبالغے، غلو اور عشقیہ موضوعات کے بجائے حقیقت پسندی، مقصدیت اور ملی وقومی شعور کو اپنی جدید غزل کا موضوع بنایا۔ حالی نے غزل کے موضوعات کے دامن کو وسیع کیا اور پہلی بار غزل میں سماجی معاملات ومضامین کو جگہ دی۔ بیسویں صدی کی مسلم معاشرت کی خرابیاں بھی ان کا موضوعِ سخن رہیں اور ان کی کی اصلاح کے لیے اُنھوں نے شاعری کو ذریعہ بنایا۔ یوں حالی قدیم وجدید غزل کے سنگم پر دکھائی دیتے ہیں۔

ہوتی نہیں قبول دعا ترکِ عشق کی
دل چاہتا نہ ہو تو دُعا میں اگر کی

عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید
خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جانا

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا
جس گھر میں سر اٹھایا اس کو بٹھا کے چھوڑا

ہو چکے حالی غزل خوانی کے دن
راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا

کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گل تر کی صورت

اُردو غزل کی تاریخ میں اکبر کی شاعری ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ان کی شاعری میں ان کا عہد اور اس کی معاشرت سانس لیتی دکھائی دیتی ہے۔اکبر نے غزل گوئی کا آغاز روایت کے تابع کیا۔مگر کچھ عرصہ کے بعد وہ طرز اپنائی جس کے وہ موجد تھے۔اکبر نے مذہب ، سیاست ، اخلاق اور معاشرت پر مغربی تہذیب وتعلیم کی یلغار کے نتیجے میں بدلتی ہوئی اقدار پر جو کڑی تنقید کی وہ اُردو غزل کے لیے ایک نئی چیز تھی۔اکبر کی غزل کا منظر نامہ ماقبل غزل سے اتنا منفرد تھا کہ ان کے رنگِ سخن کی تقلید نہ ہو سکی۔اکبر نے اپنی شاعری میں طنز و مزاح کی آمیزش کرتے ہوئے زوال آمادہ معاشرت، سماج ، تہذیب اور سیاست کی ایسی مرقع کشی کی ہے جس سے اُردو غزل نا آشنا تھی۔اکبر نے غیر معمولی حد تک غزل کو روایتی مضامین کی قیود سے آزاد کیا جو انہی کا کارنامہ ہے۔

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

ہم کو سائے پر جنوں وہ دھوپ میں مصروف کار
مس پہ ہے اپنی نظر اور سیم ان کے ہاتھ میں

نئی تہذیب میں دقت زیادہ تو نہیں ہوتی
مذاہب رہتے ہیں قائم فقط ایمان جاتا ہے

یہ موجودہ طریقے راہی ملک عدم ہوں گے
نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گے

عقائد پر قیامت آئے گی ترمیم ملت سے
نیا کعبہ بنے گا مغربی پتلے صنم ہوں گے

نہ خاتونوں میں رہ جائے گے پردے کی یہ پابندی
نہ گھونگھٹ اس طرح حاجب روئے صنم ہوں گے

علامہ اقبال ایک عہد آفریں شاعر ہیں جنھوں نے شاعری پر ہمہ گیر اثرات مرتب کیے۔ حالی و اکبر نے اُردو غزل کو جس ملی و قومی شعور سے ہم آہنگ کیا، اس کی تکمیل اقبال کے ہاتھوں ہوئی۔ اقبال نے غزل کو روحانی بصیرت اور حکیمانہ سنجیدگی عطا کی۔ ان کے ہاں غزل اور نظم کے مابین تفریق ماند پڑتی دکھائی دیتی ہے۔ اقبال کے حکیمانہ افکار جس طرح نظم کا حصہ بنے ہیں، اسی بے تکلفی کے ساتھ ان کی غزلوں میں بھی نمایاں ہوئے ہیں۔ اقبال نے غزل کے موضوعات کے دائرے کو بھی ایسی وسعت عطا کی جو اپنی مثال آپ ہے۔ یہ غزل واضح اور معین پیغام کی حامل ہونے کے باوجود شاعری کی تمام تر اعلیٰ صفات سے مزین ہے۔ جو اُردو غزل کو تاریخ میں اقبال کا کارنامہ ہے۔

عروجِ آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
تیرا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الہ الا اللہ

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے
خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے
کسے نہیں ہے تمنائے سروری لیکن
خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے

باغ بہشت سے مجھے اذن سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

انیسویں صدی کے اواخر تک بہ طور صنف غزل کی مقبولیت قائم رہی لیکن ازاں بعد شعرا نظم کی طرف مائل ہوئے۔ بیسویں صدی کے ربع اول تک بلکہ ازاں بعد بھی نظم اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی ،محبوب صنف سخن ٹھہری۔ بہ طور صنف نظم کا پھیلاؤ اور بیسویں صدی کے اوائل میں غزل مخالف رویوں اور آوازوں کے پیدا ہونے کے باوجود غزل کی مقبولیت ختم نہ ہوسکی۔۔غزل کی تاریخ کے اس عبوری دور میں حسرت ،اصغر ،فانی ،جگر ،یگانہ اور فراق کے اسما احیائے غزل کے تناظر میں بہت نمایاں ہیں۔انہی شعرا کے باوصف غزل کو نیا مزاج اور نئی شناخت ملی اور ان کی غزل کلاسیکی رنگ سے ممتاز ، جدید رویوں کی حامل دکھائی دیتی ہے۔جدید غزل کا منظر نامہ بڑی حد تک انہی شعرا کی انفرادیت سے عبارت ہے۔

اُردو غزل میں حسرت موہانی ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔حسرت نے غزل کو نیا تاثر اور لہجہ دیا۔حسرت کی غزل حسن وعشق کے جذبات اور اس کی رعنائیوں کی ترجمان ہے۔ان کے ہاں معاملاتِ عشق کے بیان میں جو سادگی ،سچائی اور انفرادیت کا انداز کارفرما ہے وہ دیگر شعرا کے ہاں مفقود ہے۔

حسرت موہانی نے عشقیہ شاعری میں واقعیت کا ایسا رنگ پیدا کیا کہ وہ عام گھریلو زندگی کی ترجمان بن گئی۔عشقیہ مضامین کے علاوہ حسرت کی شاعری میں سیاست اور فقر واستغنا کے رنگ بھی دکھائی دیتے ہیں۔ان کے ہاں ہوس نا کی کے بجائے عشق کی پاک بازی کا چلن ملتا ہے۔حسرت نے قدیم وجدید روایات اور اساتذہ کے رنگ سخن کے امتزاج سے غزل میں اپنا مخصوص انداز پیدا کیا۔اردو غزل میں عشق پاکباز کی روش اور محبوب کے حوالے سے واقعیت کا تصور انھی کا عطا کردہ ہے۔

دیارِ شوق میں ماتم بپا ہے مرگ حسرت سے
وہ وضع پارسا اس کی وہ عشق پاک باز اس کا

سیہ کار تھے باصفا ہو گئے ہم
تیرے عشق میں کیا سے کیا ہو گئے ہم

دوپہر کی دھوپ میں میرے بلانے کے لیے
وہ تیرا کوٹھے پہ ننگے پاؤں آنا یاد ہے
کھینچ لینا وہ مرا پردے کا کونا دفعتاً
اور ترا دانتوں میں وہ انگلی دبانا یاد ہے

آئینے میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حسن
آیا میرا خیال تو شرما کے رہ گئے

رسم جفا کامیاب دیکھیے کب تک رہے
حب وطن مست خواب دیکھیے کب تک رہے

غم آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں
مری ہمتوں کی پستی مرے شوق کی بلندی

فاؔنی کی شاعری ایک مخصوص مزاج و مذاق کی شاعری ہے۔ان کی غزل ان کے مزاج کی طرح منفرد ہے۔ یہ غزل انسان کی مجبوری، بے چارگی، داخلی کرب اور خواہش مرگ کی تکرار کی نمائندہ ہے۔ فانی کے ہاں رنج والم کا گہرا اور فلسفیانہ ادراک ملتا ہے۔ زندگی اور اس کے لاینحل سوالات اور مسائل کا واحد حل موت ہے۔ اسی لیے ان کے ہاں زندگی ہیچ اور کم تر دکھائی دیتی ہے۔

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کا ہے کوے خواب ہے دیوانے کا

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں
ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں

ہر نفس عمر گزشتہ کی ہے میت فانی
زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا

بس ایک آہ جہاں سوز کے اثر تک ہیں
یہ خار برق، قفس، دام آسماں، صیاد

تعینات کی حد سے گزر رہی ہے نگاہ
بس اب خدا ہی خدا ہے نگاہ والو

فصل گل آئی یا اجل آئی کیوں درزنداں کھلتا ہے
یا کوئی وحشی اور آ پہنچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا

غم بھی گزشتنی ہے خو شی بھی گزشتنی
کر غم کو اختیار کہ گزرے تو غم نہ ہو

اصغؔر کی غزل فانی کے برعکس نشاطیہ لہجے کی عکاس ہے۔ان کے مزاج کا رجائی رنگ ان کی شاعری میں کارفرما دکھائی دیتا ہے۔حکیمانہ ژرف نگاہی اور تصوف کی ایک غیر محسوس لہر ان کے کلام میں موج زن ہے۔اصغر کے ہاں جبر کے بجائے ایک امید، ایک عزم ایک تحریک کی کیفیت بہر حال نمایاں ہے جو انہی سے مخصوص ہے۔

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

یہاں کوتاہی ذوق عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

میں کامیاب دید بھی محروم دید بھی
جلووں کے اژدہام نے حیراں بنا دیا

مٹی جاتی تھی بلبل جلوہ گل ہائے رنگیں پر
چھپا کر کسی نے ان پردوں میں برق آشیاں رکھ دی

بنا لیتا ہے موج خون دل سے اک چمن اپنا
وہ پابند قفس جو فطرتاً آزاد ہوتا ہے

اے کاش میں حقیقت ہستی نہ جانتا
اب لطف خواب بھی نہیں، احساس خواب میں

جگر کی غزل ان کے اپنے مخصوص تجربات کی مظہر ہے۔ معاملات حسن وعشق کی شرح جس سرمستی، رعنائی اور کیف ووارفتگی کے ساتھ جگر کی غزل میں دکھائی دیتی ہے وہ بڑی حد تک ان کے اپنے احساس وتجربات کی دین ہے۔عشقیہ وخمریہ مضامین کے پہلو بہ پہلو سیاسی اور سماجی حقائق کا بیان بھی ان کی غزل میں ملتا ہے۔ان کے کلام میں محبت سے سرشاری کی کیفیت بہت نمایاں ہے۔

اک لفظ محبت کا ادنیٰ سا فسانہ ہے
سمٹے تو دل عاشق پھیلے تو زمانہ ہے
لالہ و گل سے تجھ کو کیا نسبت
نا مکمل سے استعارے ہیں

وہ ادائے دلبری ہو کہ نوائے عاشقانہ
جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتح زمانہ

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجیے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

جہل خرد نے دن یہ دکھائے
گھٹ گئے انساں بڑھ گئے سائے

مدت ہوئی اک حادثہ عشق کو لیکن
اب تک ہے ترے دل کے دھڑکنے کی صدا یاد

کوئی کہہ دے گلشن گلشن
لاکھ بلائیں اک نشیمن

حسن کے ہر جمال میں پنہاں
میری رعنائی خیال بھی ہے

جدید اردو غزل کی تاریخ سب سے منفرد اور امتیازی شناخت یگانہ کی ہے۔ حسرت، فانی، اصغر اور جگر وغیرہم کی شاعری اپنی جگہ مقدم لیکن غزل کے مزاج کو جو لب ولہجہ اور تیور یگانہ نے دیا، وہ اردو غزل کے لیے نئی چیز تھی۔ یگانہ کی شاعری پرانے دم توڑتے اور نئے ترتیب پاتے منظر نامے میں اس حد فاصل کا پتا دیتی ہے جہاں وہ روایتی اور پیش پا افتادہ موضوعات سے بلند ہو کر زندگی کے گہرے مسائل کی ترجمان نظر آتی ہے اور مسائل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کا حوصلہ بخشتی ہے۔ ان کی غزل میں تشکیک کا پہلو کہیں کہیں لا ادریت تک جا پہنچتا ہے۔ اپنے ذاتی نقطہ نظر اور منفرد اسلوب کی بنا پر یگانہ کی غزل ایک بڑی تبدیلی کا پتا دیتی ہے۔

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا
گناہ زندہ دلی کہیے یا دل آزاری
کسی پہ ہنس لیے اتنا کہ پھر ہنسا نہ گیا

جیسے دوزخ کی ہوا کھا کے ابھی آیا ہے
کس قدر واعظ مکار ڈراتا ہے مجھے

مصیبت کا پہاڑ آخر کسی دن کٹ ہی جائے گا
مجھے تیشے سے سر مار کر مر جانا نہیں آتا

عمر بیداری موہوم کے دھوکے میں کٹی
اب جو چونکتے ہیں تو آپ اپنا گلہ کرتے ہیں

امیدو بیم نے مارا مجھے دوراہے پر
کہاں کے دیر وحرم، گھر کا راستہ نہ ملا

فکر امروز نہ اندیشہ فردا کی خلش
زندگی اس کی جسے موت کا دن یاد نہیں

سب تیرے سوا کافر آخر اس کا مطلب کیا
سر پھرا دے جو انساں کا ایسا خبط مذہب کیا

سجدہ صبح وشام کیا کرتا
غائبانہ سلام کیا کرتا

فراق کا شمار بیسویں صدی کے ان شعرا میں ہوتا ہے جنھیں اردو غزل کی شناخت کہا جا سکتا ہے۔ وہ بلا شبہ ایک رجحان ساز شاعر ہیں۔ عشق ومحبت ان کا بنیادی موضوع ہے لیکن معاملات عشق کے بیان میں اشاریت، کیفیت، واقعیت اور معنویت ان کے کلام کو دیگر معاصرین سے ممتاز کرتی ہے۔ حسن وعشق کا شاعر ہونے کے باوجود انھوں نے ان موضوعات کو نئے زاویوں سے دیکھا اور ایسے ایسے باریک پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا جو دیگر شعرا کی نظروں سے اوجھل رہے۔ فراق کی غزل کی فضا اردو کی روایتی غزل سے بہت مختلف ہے اور اس فضا کو خلق کرنے میں فراق نے بڑی ریاضت کی ہے۔ یہ فضا کیف آگیں، پرسکون، سجل اور خواب آور سی ہے۔ فراق کی شاعری کی مخصوص فضا، جمالیاتی طرز احساس اور لب ولہجے کی نرمی وآہستہ روی ماقبل کی غزل میں کم یاب دکھائی دیتی ہے۔

دل دکھے روئے ہیں شاید اسی جگہ اے کوئے دوست
خاک کا اتنا چمک جانا ذرا دشوار تھا

تو ایک تھا مرے اشعار میں ہزار ہوا
اس اک چراغ سے کتنے چراغ جل اٹھے

ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

ہم سے کیا ہو سکا محبت میں
خیر تم نے تو بے وفائی کی

غرض کہ کاٹ دیے زندگی کے دن اے دوست
وہ تیری یاد میں ہوں یا تجھے بھلانے میں

ترے جمال کی تنہائیوں کا دھیان نہ تھا
میں سوچتا تھا مرا غم گسار کوئی نہیں

کچھ قفس کی تیلیوں سے چھن رہا ہے نور سا
کچھ فضا کچھ حسرت پرواز کی باتیں کرو

شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اداس اداس
دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں

اسی عہد میں میر و غالب کی تقلید و پیروی کا رجحان بھی غزل میں نمایاں ہوا۔ لکھنوی شعرا، عزیز، ثاقب، رسوا، صفی اور آرزو وغیرہم نے غزل کے روایتی اسلوب سے گریز کا رستہ اختیار کیا اور میر و غالب کی پیروی کی کوشش اس لیے بھی کی کہ ان اساتذہ کے اسالیب کی تجدید و آمیزش سے لفظ و معانی کی سطح پر شاعری کی معنوی توسیع کے ساتھ لکھنو کے رنگ محض کے تنقیح بھی ہو سکے۔ شاد اور وحشت کے ہاں بھی یہی تقلیدی رویہ کارفرما ہے۔

قریب اسی زمانے میں رومانوی تحریک سے وابستہ شعرا نے بھی غزلیں کہیں، جوش، حفیظ، اختر شیرانی اور احسان دانش تھے تو بنیادی طور پر نظم گو شاعر لیکن ان کے ہاں غزل کا بھی ایک ذائقہ ملتا ہے۔ جوش اسی صنف سخن سے جلد ہی تائب ہو گئے لیکن دیگر شعرا کے ہاں غزلیات کا ایک قابل لحاظ سرمایہ ہے۔ ترقی پسند شعرا نے اپنے مخصوص مقاصد و نظریات کے پرچار کے لیے بیشتر نظم ہی کا سہارا لیا غزل کو وسیلہ اظہار بنانے والوں میں مجاز، ساحر، جذبی، فیض، مجروح، ظہیر کاشمیری، قتیل شفائی، جان نثار اختر اور قاسمی وغیرہ شامل ہیں۔ غزل سے طبعی مناسبت اور غزل کی روایتی شاعری کے رموز پر جو گہری نظر اور دست رس فیض کو حاصل تھی وہ توجہ کے قابل ہے۔ اردو غزل کے روایتی علائم اور استعاروں کو فیض نے نئے مفاہیم عطا کیے۔ جو رمز و ایمائیت، طنز اور معنویت کے لحاظ سے فیض ہی کا خاصہ ہیں۔ ترقی پسند شعرا میں سے اردو غزل کو نئے معانی و مفہوم صرف فیض نے ہی آشنا کیا اور اسی بنا پر فیض اردو غزل کا ایک روشن استعارہ ہے۔

وہ جب بھی کرتے ہیں اس نطق کی بخیہ گری
فضا میں اور بھی نغمے بکھر جاتے ہیں

چمن میں غارت گل چیں سے جانے کیا گزرے
قفس سے آج صبا بے قرار گزری ہے

دست صیاد بھی عاجز ہے کف گل چیں سے
بوئے گل ٹھہری ہے نہ بلبل کی زباں ٹھہری ہے

گھر رہیے تو ویرانی دل کھانے کو آوے
رہ چلیے تو ہر گام پہ غوغائے سگاں ہے

ناصر کاظمی کی شاعری نے قیام پاکستان کے بعد بہت توجہ حاصل کی۔ ناصر کے ہاں میر کے لہجے کی بازگشت صاف سنائی دیتی ہے۔ ناصر کی شاعری میں موجود تقسیم ہندو مابعد کے مسائل، ہجرت، آبادکاری، لٹے پھٹے قافلوں کی حالت زار اور سنسان گلیاں غزل کو نئے موضوعات سے متعارف کروانے کا باعث ہیں۔ ناصر نے اپنے عہد کے اسلوب اور المیہ کو اپنی تنہائی اور اداسی کے ساتھ آمیز کر کے اپنی غزل میں ایسا مجسم کیا کہ اردو غزل جواب تک بہ طور صنف پس منظر میں تھی، پیش منظر میں آ گئی اور شعرا سے بار توجہ پانے لگی۔ ناصر نے اپنے دھیمے اور اداس لہجے میں غزل میں ایسا تاثر بھر دیا جو احساس کی سطح پر کلام کرتا ہے۔

چمک چمک کے رہ گئی نجوم وگل کی منزلیں
میں درد کی کہانیاں سنا سنا کے رہ گیا

طناب خیمہ گل تھام ناصر
کوئی آندھی افق سے آ رہی ہے

جوش جنوں میں درد کی طغیانیوں کے ساتھ
اشکوں میں ڈھل گئی ہے تیری صورت کبھی کبھی

رفتگاں کا نشاں نہیں ملتا
اُگ رہی ہے زمیں پر گھاس

بجھی آتش گل اندھیرا ہوا
وہ اجلے سنہرے ورق اب کہاں

گلی گلی آباد تھی جن سے کہاں گئے وہ لوگ
دلی اب کے ایسی اجڑی گھر گھر پھیلا سوگ

دھیان کے آتش دان میں ناصر
بجھے دنوں کا ڈھیر پڑا ہے

جنگل میں ہوئی ہے شام ہم کو
بستی سے چلے تھے منہ اندھیرے

قیام پاکستان کے بعد غزل پس منظر سے پیش منظر میں آجاتی ہے اور اردو غزل کا ایک نیا عہد شروع ہوتا ہے۔ غزل کی بہ طور صنف اس مقبولیت میں ناصر کاظمی کی صلاحیتوں کا بڑا دخل رہا۔ قیام پاکستان کے بعد احمد مشتاق، ابن انشا، شہرت بخاری، شہزاد احمد، احمد فراز، منیر نیازی، مجید امجد، شکیب جلالی، ظفر اقبال، سلیم احمد، ساقی فاروقی، افتخار عارف، ثروت حسین، عبیداللہ علیم، انجم رومانی، جمال احسانی، سلیم کوثر، جون ایلیا، خورشید رضوی، عباس تابش جبکہ شاعرات میں ادا جعفری، زہرہ نگار، کشور ناہید، پروین شاکر اور فہمیدہ ریاض نے اپنے مخصوص طرز احساس اور مذاق سخن کے باوصف اردو غزل کو فکری و فنی سطح پر وہ شناخت بخشی جو ماقبل کے منظر نامے میں دکھائی نہیں دیتی۔

اہم نکات

1 مثنوی، قصیدہ اور مرثیہ کی طرح اُردو غزل کی ابتدائی نشو و نما دَکن میں ہوئی۔

2 غزل کی اس روایت میں ابتداً مقامی عناصر کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔

3 مقامی روایت میں اظہار عشق عورت کی زبان سے ہوتا ہے۔

4 دکنی غزل کا نقطہ عروج ولی کی غزل ہے۔

5 ولی کے ہاں دیگر دکنی شعرا کی نسبت فارسی روایت سے زیادہ اکتساب کی صورت دکھائی دیتی ہے۔

6 ایہام گوئی کو باقاعدہ ایک تحریک کی صورت محمد شاہی عہد کے سیاسی، سماجی، تہذیبی و معاشرتی حالات نے عطا کی۔

7 ایہام گوئی کا یہ چلن دلی پر نادر شاہی حملے تک جاری رہا۔

8 شاہ حاتم ''دیوانِ حاتم'' مسترد کر کے اپنا کلام نئے سرے سے ''دیوان زادہ'' کے نام سے ترتیب دیا۔

9 دلی شہر کی تہذیب و ثقافت کی بربادی، افراتفری، انتشار اور انسان کی بے توقیری کے جیتے جاگتے مرقعوں سے میر و سودا کے عہد کی غزل مملو دکھائی دیتی ہے۔

10 رفتہ رفتہ دہلی اجڑنے لگی اور دیگر لوگوں کی طرح شعرائے دہلی بھی تلاشِ معاش کی خاطر ہجرت کر کے لکھنو آ گئے۔

11 لکھنوی شاعری کی فضا میں ہجر و فراق اور عشاق کے تارے گننے کی واردات کا تذکرہ نہیں ملتا۔

12 لکھنو کے متوازی اکبر آباد میں نظیر بھی اُردو شاعری کا ایک روشن نام ہے۔

13 سماجی اور معاشرتی سطح پر زندگی کی رونق بحال ہوئی تو دہلی ایک بار پھر اُردو غزل کا مرکز بن گیا۔

14 عہدِ غالب کے بعد اُردو غزل پھر زبان و بیان کی رعنائی کی طرف مائل ہوئی۔ داغ و امیر اور ان کے شاگرد ان اس میں پیش پیش رہے۔

15 ۱۸۵۷ء کے بعد کا ہندوستان سیاسی، سماجی، معاشرتی اور تہذیبی سطح پر ماقبل کے ہندوستان سے یک سر مختلف دکھائی دیتا ہے۔

16 بہ طور صنف نظم کا پھیلاؤ اور بیسویں صدی کے اوائل میں غزل مخالف رویوں اور آوازوں کے پیدا ہونے کے باوجود غزل کی مقبولیت ختم نہ ہو سکی۔

17 اسی عہد میں میر و غالب کی تقلید و پیروی کا رجحان بھی غزل میں نمایاں ہوا۔

18 ترقی پسند شعرا نے اپنے مخصوص مقاصد و نظریات کے پرچار کے لیے بیشتر نظم ہی کا سہارا لیا۔

19 ناصر کاظمی کی شاعری نے قیام پاکستان کے بعد بہت توجہ حاصل کی۔

20 قیام پاکستان کے بعد غزل پس منظر سے پیش منظر میں آ جاتی ہے اور اردو غزل کا ایک نیا عہد شروع ہوتا ہے۔

خودآزمائی

1۔ ولی کے ہاں دیگر دکنی شعرا کی نست فارسی روایت سے اکتساب کی صورت نمایاں کیوں ہے؟ وضاحت کیجیے۔

2۔ ایہام گوئی کا چلن محمد شاہی عہد میں پھلتا پھولتا دکھائی دیتا ہے۔ آپ کے خیال میں اس کی کیا وجوہات ہیں؟ جواب دیجیے۔

3۔ میر وسودا کے دور کی اردو غزل انسان کی بے توقیری و بے بضاعتی کے جیتے جاگتے مرقعوں سے مملو ہے؟ بحث کیجیے۔

4۔ دبستان لکھنو کی غزل میں باطن سے زیادہ خارجی عناصر سے دلچسپی کا رجحان نمایاں ہے۔ اظہار خیال کیجیے۔

5۔ عہد غالب کی غزل کے حوالے سے تفصیلی نوٹ لکھیے اور مثالیں بھی پیش کیجیے۔

6۔ حالی و اکبر کی شاعری مقصدیت اور ملی شعور کی آئینہ دار ہے۔ بحث کیجیے۔

7۔ اقبال کی غزل کی نمایاں صفات پر روشنی ڈالیے۔

8۔ غزل مخالف ماحول میں جن شعرا نے احیائے غزل کے لیے خدمات انجام دیں۔ ان پر مفصل نوٹ لکھیے۔

مجوزہ کتب برائے مطالعہ

1۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں، اردو غزل، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 1952ء

2۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، غزل اور مطالعہ غزل، انجمن ترقی اردو، کراچی، 1954ء

3۔ نیاز فتح پوری (مرتب) بیسویں صدی میں اردو غزل، اردو اکیڈمی، کراچی، 1987ء

4۔ فراق گورکھپوری، اردو غزل گوئی، نصرت بک ڈپو لکھنو، 1998ء

5۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، ولی سے اقبال تک، ساقی بک ڈپو، دلی، 1985ء

6۔ رشید احمد صدیقی، جدید غزل، سرسید بک ڈپو علی گڑھ، 1967ء

7۔ ڈاکٹر کامل قریشی (مرتب)، اردو غزل، اردو اکادمی، دہلی، 1987ء

8۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو (جلد دوم) مجلس ترقی ادب، لاہور، 1990ء

یونٹ نمبر 2

غزلیاتِ ولی دکنی

تحریر: ڈاکٹر محمود الرحمٰن
نظر ثانی: پروفیسر ڈاکٹر محمد کامران

فہرست

یونٹ کا تعارف

غزل اردو شاعری کی مقبول صنف سخن ہے ۔اسے ہر دور میں قبول عام حاصل رہاہے۔حسن وعشق کے بنیادی موضوع کے باوصف اس میں مذہب،فلسفہ،تصوف،اخلاقیات،حیات وممات اور دیگر موضوعات کا اظہار ہوتا رہا ہے۔غزل کی ابتدا دکن میں ہوئی اور ولی دکنی اردو غزل کا پہلا بڑا شاعر ہے۔انھیں اردو شاعری کا باوا آدم بھی کہا گیا ہے مگر تاریخی طور پر یہ درست نہیں کیونکہ ولی سے پہلے بھی غزل کی روایت ملتی ہے۔بہر حال اس کے باوجود کی اہمیت برقرار ہے کہ انھوں نے دکنی اردو کی جگہ وہ اردو رائج کی جو تھوڑے سے تغیر وتبدل کے ساتھ آج بھی مروج ہے اس یونٹ میں آپ ولی دکنی کی غزل گوئی اوران کی پانچ غزلوں کا مطالعہ کریں گے۔

یونٹ کے مقاصد

امید ہے کہ اس یونٹ کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہوسکیں گے کہ:

1۔ اردو غزل میں ان کے اجتہادات کو بیان کرسکیں۔
2۔ ایک غزل گو کی حیثیت سے ولی دکنی عظمت پر اظہار کرسکیں۔
3۔ ولی کے کلام کے مقبول ہونے کی وجوہات بیان کرسکیں۔
4۔ ولی کی چند غزلوں کو سمجھ کر ان کی تشریح کرسکیں۔

1۔ ولی دکنی

(1668ء۔1720/25ء)

اردو کے اس عظیم المرتبت شاعر کے نام اور سن ولادت کے بارے میں بڑا اختلاف ہے۔محمد ولی، ولی محمد، ولی اللہ اور شمس ولی وغیرہ مختلف نام ادبی تذکروں میں ملتے ہیں۔ وطن کے متعلق بھی عرصے تک اختلاف رہا۔کوئی گجرات بتاتا تھا تو کوئی احمد آباد اور کوئی انھیں دکنی یا اورنگ آبادی کہتا تھا۔ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحقیق کے مطابق ان کا نام ولی محمد ہے۔وطن کے سلسلے میں وہ لکھتے ہیں کہ ولی کے باپ دادا گجرات سے دکن ہجرت کر گئے تھے۔اس ہجرت اور دکن میں رہنے کے باوجود سے گجرات سے ان کا تعلق باقی تھا لیکن جیسے غالب اکبرآباد سے اور ڈپٹی نذیر احمد بجنور سے دہلی آ کر دہلوی ہو گئے تھے اسی طرح ولی بھی گجرات سے تعلق رکھنے کے باوجود دکن میں آ کر دکنی ہو گئے تھے۔

رام بابو سکسینہ کے مطابق ولی 1668ء میں پیدا ہوئے اور 1744ء میں وفات پائی۔ جب کہ ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق ان کی وفات 25-1720ء کے درمیان ہوئی۔ان کے والد کا نام شریف محمد تھا۔ یہ شیوخ قادریہ سے تعلق رکھتے تھے۔کامل بیس سال تک تحصیل علوم کرتے رہے۔1700ء میں سید ابوالمعالی کے ہمراہ دلی کا سفر اختیار کیا جہاں سعداللہ گلشن سے ملاقات کی۔بعض تذکرہ نگاروں کے قول کے مطابق ان کے مرید بھی ہوئے۔قاضی اختر جوناگڑھی کا خیال ہے کہ ''گلشن گجراتی تھے اور ولی سے ان کے تعلقات احمد آباد اور برہان پور کے زمانہ قیام میں پیدا ہوئے ہوں گے۔'' بہرحال، ولی کی شاہ گلشن سے یہ ارادت مذہبی ہو یا نہ ہو لیکن ادبی ضرور ہے۔کیونکہ شاہ گلشن ہی نے ان کی موزونی طبع اور شاعری سے غیر معمولی دلچسپی دیکھ کر ان کو مشورہ دیا تھا کہ فارسی شعرا کے کلام سے استفادہ کریں۔نیز انھوں نے ہی دکنی کی جگہ دلی کی زبان اختیار کرنے کا مشورہ دیا تھا۔25-1720 کے درمیان وفات پائی۔کلیات اور ایک رسالہ ''نورالمعرفت'' یادگار چھوڑا۔

ولی کو اردو کے تذکرہ نگاروں نے اردو شاعری کا باوا آدم کہا ہے۔تاریخی طور پر یہ بات صحیح نہیں ہے۔اردو شاعری کی ابتدا بہت پہلے امیر خسرو کر چکے تھے۔پھر دکن میں قلی قطب شاہ سب سے پہلے اردو کی کلیات مرتب کر چکے تھے لیکن اس تحقیق کے باوجود اردو شاعری کی تاریخ میں ولی کے مرتبے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

جس زمانے میں دکن میں اردو شاعری ترقی کر چکی تھی، شمالی ہند میں اس وقت بھی فارسی شاعری کا دور دورہ تھا۔ولی کے اثر سے شمالی ہند میں اردو غزل کی بساط پہلی بار بچھی۔صف اول کے شعرا نے اردو غزل میں طبع آزمائی کی۔سودا جیسے عظیم شاعر کے استاد شاہ حاتم ولی کو اپنا استاد تسلیم کرتے تھے۔حتی کہ میر تقی میر جیسے نکتہ چیں اور نازک مزاج شاعر بھی یہ کہے بغیر نہ رہ سکا:

واقف نہیں ہم یوں ہی کچھ ریختہ گوئی کے
معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

ولی بلند پایہ شاعر تھے۔ان کا ایک بہت بڑا کمال یہ ہے کہ اردو زبان کی اصلاح کے ساتھ ساتھ نہایت مستحکم بنیادوں پر

اردوغزل کی عمارت بلند کی۔انھوں نے اساتذہ فارسی کے کلام کو اپنے سامنے رکھا اور ان مضامین کو اردو میں پیش کیا۔لیکن ولی کی تقلید اندھی نہ تھی بلکہ خلاقانہ تھی۔ولی کی مقبولیت کا سب سے بڑا راز ان کی زبان میں مضمر ہے۔ان کی زبان کو عموماً ''دکنی'' کہاجاتا ہے لیکن جب ہم دکن کے شعرا 'وجہی''،'غواصی'،'نصرتی'،' فراقی'،'ہاشمی' وغیرہ سے ان کا مقابلہ کرتے ہیں تو ہمیں ایک نمایاں فرق محسوس ہوتا ہے۔ولی دکنی ہونے کے باوجود ان سب سے بالکل علیحدہ نظر آتے ہیں۔ان کے یہاں دکنی اثرات ہوتے ہوئے بھی'' وہ کچھ'' ہے جو متذکرہ دکنی شعرامیں سے کسی کے یہاں نہیں ہے ہم بلاخوف تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ ولی کی زبان نہ دکنی ہے اور نہ ہی یہ اردوئے معلیٰ ہے بلکہ ان دونوں کا حسین امتزاج ہے جس میں کہیں کہیں فارسی کی ملمع کاری نے اور بھی حسن پیدا کر دیا ہے۔صفیر بلگرامی نے ولی کے اشعار کی تین قسمیں بیان کی ہیں:

(1) وہ اشعار جو خالص دکنی زبان میں ہیں اور ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہو سکتی مثلاً

ترے بن مج کوں اے ساجن یو گھر اور بار کرنا کیا
اگر تو نہ اچھے مج کن تو یہ سنسار کرنا کیا

(2) وہ اشعار جن کے بعض الفاظ بدل دیئے جائیں تو اس وقت ان کی زبان بن سکتی ہے۔مثلاً یہ شعر:

نہ ہوئے چرخ گردش سوں اس کے حال میں گردش
بجا ہے قطب کے مانند استقلال عاشق کا

(3) وہ اشعار جو بالکل اس وقت کی زبان میں ہیں:

جاری ہوئے مرے آنسو یوں سبزۂ خط دیکھ
اے خضر قدم سیر کر اس آب رواں کا

ولی کے یہاں فارسی اور عربی زبانوں کا بھی کافی اثر ہے۔ان کی بیشتر تشبیہات،استعارات اور تراکیب فارسی اور عربی ہیں۔انھوں نے زلف کے لیے دود چراغ گل،لیل زمستان،دیجور کا تماشا جیسی تراکیب استعمال کی ہیں۔ان کے کلام میں رعایت لفظی اور صنائع بدائع کی بھی کثرت ہے۔ولی کی زبان میں سادگی،صفائی اور سلاست بدرجہ اتم موجود ہے۔بعض اشعار پر تو بالکل آج کی زبان کا دھوکہ ہوتا ہے۔طرز ادا میں دل کشی،موسیقیت اور روانی ہے۔الفاظ کی نشست میں نزاکت اور بندش میں چستی ہے۔غرض ان کے یہاں موضوعات میں بوقلمونی اور رنگا رنگی پائی جاتی ہے۔جدت تخیل،نزاکت خیال اور بلند پروازی کی کمی نہیں۔ڈاکٹر سید عبداللہ نے ولی کو ایسا جمال دوست شاعر قرار دیا ہے جس کا عشق دل سے زیادہ آنکھ سے متعلق ہے اور اس حوالے سے انھیں طرز عراقی کا مقلد کہا ہے جس میں معاملات عشق کے بیان کی نسبت احساسات حسن کا بیان زیادہ ہوتا ہے ان کے خیال میں ولی مضامین کے بجائے پیرائیہ بیان کی بنا پر بڑا شاعر ہے اور اس پیرائیہ بیان میں بھی ان کے طریق تشبیہ کی زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

تصوف اردو غزل کا ایک اہم موضوع ہے۔ولی نے تصوف اور اخلاقی نظریوں کو خشک بحثوں کے دائرے سے نکال کر سچی

شاعری بنا دیا۔ان کے یہاں وحدت الوجود عشق ومحبت، قربت الٰہی اور بے ثباتی عالم کے مضامین بھی ملتے ہیں۔

اگر چہ ان کے کلام میں کہیں کہیں دکنی الفاظ کھٹکتے ہیں، لیکن بالعموم ایسی غزلیں بھی مل جاتی ہیں جن میں نہایت ہی صاف وسادہ زبان، دلنشیں تراکیب، عمدہ تشبیہات اور استعارے استعمال کیے گئے ہیں۔ان کی غزلوں میں تازگی اور ندرت ایسی ہے کہ آج تین سو سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود اس میں کوئی فرق نہیں آیا۔

ولی نے اردو زبان وغزل کی تعمیر وترقی میں جو حصہ لیا ہے وہ ادبی لحاظ سے نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ان کے مرتبے کا اندازہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی کے مندرجہ ذیل جملے سے بخوبی ہوسکتا ہے۔

''شمالی ہند میں تو ولی مشعل ہدایت ہی بن کر آئے''

(مرتب: کلیاتِ ولی، مقدمہ، اترپردیش اکادمی لکھنؤ، ۱۹۸۹ء، ص ۵٦)

ڈاکٹر عبادت بریلوی کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ:

''ولی کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے غزل کی صنف کے صحیح معیار قائم کیے۔
اس کی زبان کو فارسی کی روایت سے آشنا کیا۔غزل کی صنف ولی کے ہاتھوں تقلید سے
آزاد ہوئی اور اسی میں اصلیت اور واقعیت کا رنگ وآہنگ پیدا ہوا۔''

(ولی اورنگ آبادی، ادارہ ادب وتنقید، لاہور، ۱۹۸۱ء، ص ۲۱۰/۲۱۱)

غرض، ولی کی کوششوں کی بدولت غزل کی روایت کو سمجھنے اور انھیں برتنے کی ایک فضا قائم ہوگئی۔ایک ارضی اور انسانی فضا کا احساس اجاگر ہوا۔حسن اور لوازمات، حسن اور متعلقات عشق کی حقیقت واقفیت سے بھرپور تصویریں ولی کے اشعار میں نمایاں ہوگئیں:

ولی شعر میرا سراپا ہے درد
خط وخال کی بات ہے خال خال

2۔ اہم نکات

1۔ ولی گجرات سے تعلق رکھتے تھے۔

2۔ دلی کے سفر کے دوران مشہور بزرگ شاہ سعداللہ گلشن نے انھیں دکنی کی بجائے دلی کی زبان استعمال کرنے اور فارسی مضامین کو اردو میں سمونے کا مشورہ دیا۔

3۔ ولی اردو شاعری کے باوا آدم نہیں۔ان سے پہلے قلی قطب شاہ اپنا کلیات مرتب کر چکے تھے۔

4۔ ولی کے اردو کلام سے شمالی ہند کے شعرا متاثر ہوئے اور انھوں نے بھی اردو میں طبع آزمائی کی۔

5۔ ولی کی زبان صاف اور سادہ ہے۔ان کے کلام میں دلکشی حسن اور موسیقت پائی جاتی ہے۔

6۔ ولی نے اردو غزل کو پروان چڑھایا اور اسے نیا رنگ و آہنگ عطا کیا۔

3۔ تشریحات

3.1 غزل نمبر1

وو صنم جب سوں بسا دیدہ حیران میں آ
آتش عشق پڑی عقل کے سامان میں آ
یاد آتا ہے مجھے جب دوگل باغ وفا
اشک کرتے ہیں مکاں گوشہ داماں میں آ
نالہ و آہ کی تفصیل نہ پوچھو مجھ سوں
دفتر درد بسا عشق کے دیوان میں آ
شیخ یاں بات تری پیش نہ جاوے ہرگز
عقل کوں چھوڑ کے مت مجلس رندان میں آ
غم سوں تیرے ہے ترحم کا محل حال ولی
ظلم کو چھوڑ سجن شیوۂ احسان میں آ

شعر نمبرا

وو صنم جب سوں بسا دیدہ حیران میں آ
آتش عشق پڑی عقل کے سامان میں آ

وو = وہ

سوں = سے

شاعر کہتا ہے کہ میرا محبوب جب سے میری حیران آنکھوں میں آ کر بس گیا ہے، 'اپنی عقل' اپنی سمجھ، اپنا شعور، سب کچھ عشق کی آگ سے جل کر برباد ہو چکا ہے۔ اب یہ صورت حال ہے کہ ہر آن محبوب کا تصور اور اس کی یاد ہے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہو چکی ہے۔ شاعر دراصل اس حقیقت کی وضاحت کر رہا ہے کہ جب محبوب کا حسن و جمال آنکھوں میں سما جاتا ہے اور اس کا دلکش دلربا پیکر ہمہ وقت نگاہوں میں گھومتا رہتا ہے اس وقت عقل خرد زائل ہو جاتی ہے۔ شعور وادراک کو زنگ لگ جاتا ہے گویا عشق آگ میں عقل وشعور جل کر خاک ہو جاتے ہیں۔

شعر نمبر2

یاد آتا ہے مجھے جب دوگل باغ وفا
اشک کرتے ہیں مکاں گوشہ داماں میں آ

گل باغ وفا = باغ محبت کا پھول

مکاں کرنا = ٹھہرنا۔ بسیرا کرنا

شاعر کہتا ہے کہ جب محبوب کی یاد آتی ہے تو میرا دل بھر آتا ہے، آنکھ پرنم ہو جاتی ہے اور آنسوؤں سے اپنا دامن لبریز ہو جاتا ہے۔ واضح رہے کہ اس شعر میں شاعر نے محبوب کو باغ وفا کے پھول سے تشبیہ دی ہے جو اپنی نوعیت کی انوکھی مثال ہے۔ شاعری میں محبوب کو بے وفا تسلیم کیا جاتا ہے، لیکن ولی دکنی کا انداز دیگر شعرائے اردو سے بالکل مختلف ہے۔ وہ اسے باغ محبت کا ایک پھول قرار دے رہے ہیں۔ ایک ایسا پھول کہ جب اس کی یاد آتی ہے تو آنسو بہہ بہہ کر دامن شاعر میں بسیرا لینے لگتے ہیں، یعنی اشکوں سے دامن بھر جاتا ہے۔ اس شعر میں اشک کا دامن میں مکاں کرنا بھی اچھوتی ترکیب ہے۔

شعر نمبر 3

نالہ و آہ کی تفصیل نہ پوچھو مجھ سوں
دفتر درد بسا عشق کے دیوان میں آ

شاعر کہتا ہے کہ میں جو اس قدر آہ وزاری کر رہا ہوں اس کی تفصیل تمھیں بتا نہیں سکتا۔ بس اتنا عرض کیے دیتا ہوں کہ میں عشق میں مبتلا ہوں۔ محبوب کے فراق نے میرا حال تباہ کر دیا ہے۔ میرے دل میں درد والم کی لہریں موجزن ہیں۔ محبوب کی جدائی میں ہمہ وقت آہ وفغاں کرتا ہوں۔ بادی النظر میں شاعر یہ بتانا چاہتا ہے کہ عشق کے نتیجے میں آہ وزاری کا ایک لامتناہی سلسلہ قائم ہو گیا ہے اور درد نے دل میں بسیرا کر لیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے اس آفت جاں سے چھٹکارا ممکن نہیں۔

شعر نمبر 4

شیخ یاں بات تری پیش نہ جاوے ہرگز
عقل کوں چھوڑ کے مت مجلس رندان میں آ

بات پیش نہ جاوے = تقریر یا بحث میں غالب نہ آنا

کوں = کو

مجلس رنداں = مے نوشوں کی بزم۔ شراب خانہ

شاعر اس شعر میں شیخ کو یہ نصیحت کر رہا ہے کہ وہ میخواروں کی محفل میں آ کر اخلاقیات کی بحث نہ چھیڑے اور نہ انھیں توبہ شکنی پر آمادہ کرے۔ ناصح لاکھ اپنی چرب زبانی اور حسن گفتار پر نازاں ہو، لیکن یہاں بزم رنداں میں وہ اپنی تقریر کا جادو نہیں جگا سکے گا۔ اس کے پند ونصائح زود اثر ثابت نہ ہو سکیں گے۔ رندوں کا اپنا ایک مزاج اور شیوہ ہے انھیں علم وحکمت اور دانش وحکمت کے موتی رولنے سے کیا کام۔ وہ اپنی میخواری میں مست ہیں۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ شیخ یا ناصح عقلمندوں اور دانشوروں کے سامنے اپنی فضیلت ودانائی کا اظہار کرتا رہے۔

شعر نمبر 5

غم سوں تیرے ہے ترحم کا محل حالی ولی
ظلم کو چھوڑ سجن شیوۂ احسان میں آ

غم سوں تیرے = تیرے غم کی وجہ سے
ترحم کا محل = رحم کے قابل۔ قابل التفات
سجن = محبوب

شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب! تیرے غم اور فراق میں ولی کی حالت ناگفتہ بہ ہو چکی ہے۔ تیری بے اعتنائی، بے وفائی اور بے رحمی نے اس کا جینا اجیرن کر دیا ہے۔ اب تجھ سے ولی کی یہی التجا ہے کہ خدا کے واسطے اپنے ظلم وستم کا شیوہ ترک کر دے اور رحم و کرم کا انداز اپنا لے۔ ذرا دیکھ تو! تیرے جور و جفا کے نتیجے میں ولی کی زندگی کس قدر سوہان روح ہو گئی ہے۔ اب تو اپنے اس عاشق پر احسان کر اور بے رخی کا شیوۂ ترک کر دے۔

3.2 غزل نمبر 2

شعر نمبر 1

مت غصے کے شعلے سوں جلتے کوں جلاتی جا
ٹک مہر کے پانی سوں توں آگ بجھاتی جا

کوں = کو
توں = تو
ٹک = ذرا
مہر = مہربانی، لطف و کرم

اس شعر میں شاعر محبوب سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے کہ میں ویسے ہی تیری محبت کی آگ میں جل رہا ہوں۔ اس پر مستزاد یہ کہ تو غصے میں ناراض ہو کر مجھے جلائے جا رہی ہے۔ میں اتنی ساری تپش کو کیوں کر برداشت کر سکوں گا۔ لہٰذا مجھ ناتواں اور خاکستر ہونے والے عاشق پر رحم کر۔ اپنی عنایات اور لطف و کرم کی بارش برسا اور اس بیکراں تپش کو بجھا دے۔ تجھ سے میری یہ عرض ہے کہ اس وقت مجھے تیرے ظلم وستم اور بے رخی و بے اعتنائی کی نہیں، مہر و الفت کی ضرورت ہے تاکہ میرے جسم و جاں کی تپش زائل ہو اور تیرے عشق کی بدولت جس بے کلی کی کیفیت ہے، وہ جاتی رہے۔

ولی نے پوری غزل میں محبوب کے لیے تانیث کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ اردو غزل گوئی میں ان کی یہ جدت بعد میں آنے والے شاعروں نے تقریباً نظر انداز کر دی۔

شعر نمبر 2

تجھ چال کی قیمت سوں دل نئیں ہے مرا واقف
اے مان بھری چنچل ٹک بھاؤ بتاتی جا

نئیں = نہیں
مان بھری = مغرور متکبر
چنچل = شوخ، الھڑ
بھاؤ = قیمت۔ دام

شاعر محبوب سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے کہ اے دل کو موہ لینے والی! تیری چال حد درجہ ہوشربا ہے، لیکن مجھے اس چال کی قیمت نہیں معلوم۔ اے شوخ اور مغرور محبوب! تو خود ہی اپنی اس الھڑ چال کی قیمت بتا دے۔ بادی النظر میں شاعر محبوب کی دلفریب ودلکش چال کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ واضح رہے کہ محبوب کے سراپا بیان میں کاکل ورخسار، چاہ ذقن اور چشم وابرو کا ذکر عموماً کیا جاتا ہے مگر الھڑ چال کا تذکرہ غالباً ولی دکنی کے یہاں پہلی مرتبہ کیا گیا ہے۔

شعر نمبر 3

اس رات اندھاری میں مت بھول پڑوں تجھ سوں
ٹک پاؤں کے جھانجھر کی جھنکار سناتی جا

اندھاری = اندھیری
جھانجھر = پائل۔ پاؤں کا نور

شاعر کہتا ہے کہ غضب کی اندھیری رات چھائی ہوئی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو پرہول اندھیرے میں راستے سے بھٹک جاؤں اور تجھ سے جدا ہو جاؤں اور ایسی صورت حال میں تیری جدائی مجھ سے کیوں کر برداشت ہو سکے گی۔ لہٰذا مناسب یہی ہے کہ تو پائل بجاتی جا تاکہ اس اندھیری رات میں آواز کی سمت خود کو متوجہ رکھوں اور تجھ سے بچھڑنے نہ پاؤں۔

یہاں یہ نکتہ پیش نظر ہے کہ اندھیری رات میں محبوب سے بچھڑنے کے احتمال میں شاعر اس سے ہاتھ پکڑنے کی درخواست نہیں کر رہا ہے بلکہ پائل کی جھنکار سنانے کی فرمائش کر رہا ہے۔ گویا اس طرح ولی نے عشق کے آداب کو ملحوظ رکھا ہے اور یہ پاکیزگی خیال کی انتہا ہے۔ اس شعر میں نہایت اچھوتا خیال پیش کیا گیا ہے۔

شعر نمبر 4

مجھ دل کے کبوتر کوں پکڑا ہے تیری لٹ نے
یہ کام دھرم کا ہے ٹک اس کو چھڑاتی جا

لٹ = زلف۔ بالوں کی لڑی

دھرم = مذہب

شاعر محبوب سے کہتا ہے کہ تیری زلفوں کی لڑی نے میرے دل کے کبوتر کو پکڑ کر قید کر رکھا ہے یعنی میرا دل تیری محبت کے دام میں پھنس کر رہ گیا۔ مذہب کی یہی تعلیم ہے اور اخلاق کا تقاضا بھی یہی ہے کہ کسی قیدی کو قید سے رہائی دلانے کی ترکیب کی جائے۔ لہٰذا میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ میرے دل کے نازک اور معصوم کبوتر کو اپنی زلف کے ناگ سے چھڑا دے۔ اگر تو ایسا کرے گا تو گویا مذہب کا فریضہ انجام دے گا اور خیر و فلاح کا کام کرے گا۔ بادی النظر میں شاعر محبوب کو مائل بہ کرم ہونے کی تلقین کر رہا ہے اور اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کی غرض سے اس نے مذہب کا واسطہ دیا ہے کہ شاید ظالم اس طرح ظلم و ستم سے باز آ جائے۔

شعر نمبر 5

تجھ گھر کی طرف سندر آتا ہے ولی دایم
مشتاق درس کا ہے، ٹک درس دکھاتی جا

سندر = خوبصورت۔ یہاں۔ محبوب مراد ہے

درس = نظارہ۔ درشن۔ دیدار

شاعر کہتا ہے کہ اے محبوب! تیرے گھر کی طرف چل کر ولی آ رہا ہے۔ وہ تیرے دیدار کا پیاسا ہے تو اسے اپنے حسن و جمال کی جھلک دکھا دے تا کہ عاشق کی حسرت پوری ہو جائے۔ تیرے رخ زیبا کا دیدار ہی اس کی عین آرزو ہے لہٰذا اس کو دید سے محروم نہ رکھ۔

3.3 غزل نمبر 3

یادکرنا ہر گھڑی اس یار کا
ہے وظیفہ مجھ دل بیمار کا
آرزوئے چشمہ کوثر نہیں
تشنہ لب ہوں شربت دیدار کا
کیا کہے تعریف دل ہے بے نظیر
حرف حرف اس مخزن اسرار کا
مسند گل ، منزل شبنم ہوئی
دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا
اے ولی ہونا سریجن پر نثار
مدعا ہے چشم گوہر بار کا

تشریحات

شعرنمبر1

یادکرنا ہر گھڑی اس یار کا
ہے وظیفہ مجھ دل بیمار کا

وظیفہ=مقدس اور مبارک کام جو انتہائی دلجمعی کے ساتھ کیا جائے۔

مجھ دل بیمار کا= میرے بیمار دل کا۔ وہ دل جو عارضہ عشق میں مبتلا ہو۔

شاعر کہتا ہے کہ عشق میں مبتلا ہونے سے پہلے ہماری زندگی میں کتنے ہی مشغلے اور ہنگامے تھے لیکن جب سے ہمارا دل محبوب کی محبت کا اسیر ہوا، اس کا ایک ہی کام رہ گیا ہے اور وہ یہ کہ ہر گھڑی ہر نفس محبوب کو یاد کرتا ہے۔ صبح سے شام تک محبوب کی مالا جپتا رہتا ہے۔ اس مقدس کام کے سوا دل بیمار کا اور کوئی وظیفہ نہیں۔ ولی نے اس مطلع میں عاشق کے جذبات اور اس کی کیفیت کو بڑے ہی سلیقے سے خوب صورت پیرائے میں بیان کر دیا ہے۔ یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ شاعر نے عاشق کے اس فعل کو وظیفہ یعنی مقدس کام قرار دیا ہے۔ ولی کے خیال میں پاکیزہ محبت میں محبوب کو یاد کرتے رہنا کسی حال میں تقدس آمیز کام سے کم نہیں۔

شعرنمبر2

آرزوئے چشمہ کوثر نہیں
تشنہ لب ہوں شربت دیدار کا

چشمہ کوثر= بہشت کی ایک نہر۔ جنت کا حوض

تشنہ لب= پیاسا

شاعر کہتا ہے کہ مجھ عاشق کو بہشت کی نہر کی کوئی تمنا، کوئی آرزو نہیں! میں تو صرف اپنے محبوب کا جلوہ دیکھنے کا متمنی ہوں اور یہی میرا عین مقصد حیات ہے۔ چونکہ محبوب کو دیکھنے میں عاشق کے لیے ''مٹھاس'' اور ''سکون'' ہوتا ہے اسی لیے شربت دیدار کہا جاتا ہے۔

واضح رہے کہ اس شعر میں ''چشمہ کوثر''، ''تشنہ لب'' اور ''شربت دیدار'' کے درمیان معنوی اور لفظی مناسبت پائی جاتی ہے۔

شعرنمبر3

کیا کہے تعریف دل ہے بے نظیر
حرف حرف اس مخزن اسرار کا

بےنظیر=لا ثانی بے مثال

کیا کہے=کیا کرے

مخزن اسرار=رازوں کا خزانہ

شاعر کہتا ہے کہ ہمارا دل اپنے محبوب کی تعریف وتوصیف کیوں کر بیان کرسکتا ہے۔ وہ تو خوب صورت اور حسین وجمیل رازوں کا ایک خزانہ ہے۔ اس مخزن اسرار کی ہر بات، ہر چیز اور ہر ادا بے مثال ہے۔ عاشق کی زندگی نئ باتوں کی تلاش میں گزر جاتی ہے اور صورت حال یہ ہے کہ محبوب کی ہر بات ''مخزن اسرار'' کی حیثیت رکھتی ہے جس تک نہ رسائی ممکن ہے اور نہ ہی جس کی تعریف عاشق کے بس میں ہے۔ ولی کا یہ شعر عارفانہ مضمون پر مشتمل ہے اور ذات باری تعالیٰ کی جانب اشارہ مقصود ہے۔

شعر نمبر 4

مسند گل ، منزل شبنم ہوئی
دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

دیدۂ بیدار=کھلی ہوئی آنکھ۔ بینا آنکھ

شاعر کہتا ہے کہ شبنم بلند فضاؤں سے نیچے، زمین کی جانب آئی تو اس نے پھولوں کی مسند کو اپنا ٹھکانا بنایا۔ ہر صبح شبنم کے قطرے پھولوں کی پنکھڑیوں پر جگمگاتے ملتے ہیں۔ یہ دراصل شبنم کا رتبہ ہے، اس لیے کہ وہ دیدۂ بینا کی حیثیت رکھتی ہے۔ ولی دکنی نے اس شعر میں ایک فلسفیانہ مضمون باندھا ہے وہ کہتے ہیں کہ شبنم کھلی ہوئی اور بینا آنکھ رکھتی ہے، اسی لیے اسے پھولوں کی قربت حاصل ہوئی۔ دراصل، شبنم ہمارے لیے ایک مثال ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ دیدۂ بینا کا مرتبہ ہمیشہ بلند ہوتا ہے۔

شعر نمبر 5

اے ولی ہونا سریجن پر نثار
مدعا ہے چشم گوہر بار کا

سریجن=محبوب

مدعا=مقصد۔ مطلب

چشم گوہر بار=موتی برسانے والی آنکھ، یعنی رونے والی آنکھ

شاعر مقطع میں خود سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ اے ولی! یہ آنکھیں بلا مقصد اور بلا وجہ آنسو کے موتیوں کی بارش نہیں کرتیں۔ ان کا مدعا یہ ہے کہ ان موتیوں کو محبوب پر نچھاور کریں اور پھر ان آنسوؤں کی قدر و قیمت کا اندازہ کون کرسکتا ہے جنھیں محبوب کے قدموں میں جگہ مل جائے۔ بادی النظر میں شاعر عاشق کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کی اہمیت اجاگر کر رہا ہے۔

3.4 غزل نمبر 4

ترالب دیکھ حیواں یاد آوے
ترا مکھ دیکھ کنعاں یاد آوے
ترے دو نین جب دیکھوں نظر بھر
مجھے تب نرگستان یاد آوے
تری زلفاں کی طولانی کوں دیکھے
مجھے لیل زمستاں یاد آوے
ترے مکھ کے چمن کے دیکھنے سوں
مجھے فردوس رضواں یاد آوے
تری زلفاں میں یو مکھ جو کہ دیکھے
اسے شمع شبستان یاد آوے

شعر نمبر 1

ترالب دیکھ حیواں یاد آوے
ترا مکھ دیکھ کنعاں یاد آوے

حیواں = اشارہ ہے ظلمت کے اس چشمے کی طرف جس کا پانی پینے سے مردہ بھی جی اٹھتا ہے۔
کنعاں = حضرت یوسف کی پیدائش کی جگہ۔
مکھ = چہرہ۔منہ

شاعر کہتا ہے کہ جب میں ترالبِ شیریں دیکھتا ہوں تو مجھے فوراً آب حیواں یاد آ جاتا ہے جس طرح ظلمات کے چشمے کا پانی یعنی آب بقا پینے سے زندگی مل جاتی ہے اسی طرح تیرے لب کی تاثیر سے مجھے حیات ابدی حاصل ہو جائے گی۔ یہی حال تیرے حسین وجمیل چہرے کا ہے کہ اس پر نظر پڑتے ہی وہ اہم اور تاریخی شہر کنعاں یاد آ جاتا ہے جہاں حضرت یوسف علیہ السلام جیسی خوب صورت ہستی جلوہ گر ہوئی تھی۔ ان تلمیحات کے پس منظر میں شاعر محبوب کے لب و رخسار کی تعریف وتوصیف بیان کرر ہا ہے۔

شعر نمبر 2

ترے دو نین جب دیکھوں نظر بھر
مجھے تب نرگستان یاد آوے

نین = آنکھ

نرگستان = وہ جگہ جہاں بہت سے نرگس کے پھول ہوں (شعرا نرگس کے پھول سے) اسے محبوب کی آنکھ سے تشبیہ دیتے ہیں۔

شاعر کہتا ہے کہ جب میں تری ان خوبصورت اورغزالی آنکھوں کو دیکھتا ہوں تو مجھے وہ مقام یادآ جاتا ہے جہاں نرگس کے بے شمار پھول اگے ہوئے ہوں اور جن کی دلفریبی آنکھوں کی خیرہ کیے دیتی ہے۔ تیری آنکھیں بھی فی الحقیقت گلہائے نرگس کی مانند دلآ ویزو دلنشیں ہیں۔ یہاں شاعر نے محبوب کی آنکھ کونرگس کے پھول سے تشبیہ دی ہے۔

شعرنمبر 3

تری زلفاں کی طولانی کوں دیکھے
مجھے لیل زمستاں یاد آوے

زلفاں = زلف

طولانی = دراز

لیل زمستان = سردیوں کی رات جو بہت طویل ہوتی ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ جب محبوب کی لمبی لمبی زلفوں کو دیکھتا ہوں تو مجھے سردیوں کی طویل رات یادآ جاتی ہے جو کاٹے نہیں کٹتی۔ محبوب کے گیسو بھی طویل اور دراز ہیں کہ ہم اسے ماپنا چاہیں تو ماپ نہ سکیں۔ شاعر نے یہاں زلف کی رعایت سے لیل (رات) کا لفظ استعمال کیا ہے کہ دونوں کی نمایاں صفت سیاہی ہے اور چونکہ سردیوں کی رات طویل ہوتی ہے۔ لہٰذا محبوب کی زلف کو لیل زمستاں سے تشبیہ دی گئی ہے جس میں سیاہی بھی ہے اور درازی بھی۔

شعرنمبر 4

ترے مکھ کے چمن کے دیکھنے سوں
مجھے فردوس رضواں یاد آوے

شاعر کہتا ہے کہ جب میں تیرے خوب صورت چہرے کے رنگین و دلفریب چمن کو دیکھتا ہوں تو بہشت کا حسین باغ یادآ جاتا ہے گویا حسن، نکھار اور دلفریبی میں تیری شکل وصورت اور تیرا رخ زیبا باغ فردوس سے کم نہیں۔ ولی نے محبوب کے حسن و جمال کی تعریف نہایت دلنشیں پیرائے میں کی ہے۔ اس شعر میں حسن تغزل پوری طرح نمایاں ہے۔

شعرنمبر 5

تری زلفاں میں یو مکھ جو کہ دیکھے
اسے شمع شبستان یاد آوے

یو = یہ

شبستان=خلوت خانہ،حرم سرا

شاعر کہتا ہے کہ تیری کالی کالی زلفوں کے درمیان تیرا روشن چہرہ دکھ کر مجھے وہ شمع یاد آ جاتی ہے جو اندھیری اور پر ہول رات میں خواب گاہ کے اندر فروزاں ہو۔کالی کالی زلف اور روشن و منور چہرے کی رعایت سے شمع شبستان کی ترکیب استعمال کی گئی ہے جو اچھوتی ہے اور ولی کے فنکارانہ عظمت کا پتہ دیتی ہے۔

3.5 غزل نمبر 5

آج کی رین مجھ کوں خواب نہ تھا
دونوں انکھیاں میں غیر آب نہ تھا
خون دل کوں کیا تھا میں نیں نوش
اور شیشے میں شراب نہ تھا
آہ پر آہ کھینچتا تھا میں
آج کی رات کچھ حساب نہ تھا
کیا سبب تھا خود نہیں آیا
کہ اسے مجھ ستے حجاب نہ تھا
گلۂ شوخ اے ولی کرنا
ہر کسی کن تجھے صواب نہ تھا

شعر نمبر 1

آج کی رین مجھ کوں خواب نہ تھا
دونوں انکھیاں میں غیر آب نہ تھا

رین=رات(یہ لفظ آج بھی گیتوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔)

کوں=کو(دکنی اردو میں یہ لفظ اسی طرح استعمال ہوتا تھا۔)

انکھیاں=آنکھیں(پہلے''اں''بڑھا کر فارسی کے قاعدے سے جمع بناتے تھے۔)

شاعر کہتا ہے کہ رات اگرچہ انسانی زندگی میں نینداور آرام کے لیے آتی ہے،لیکن عاشقوں کی کیفیت کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ان کی شب فرقت،شب غم ہوتی ہے اور شب غم بری بلا ہے۔ولی کہتے ہیں کہ آج کی رات نیند مجھ سے بہت دور تھی کیونکہ نیند کی جگہ دونوں آنکھوں میں آنسوؤں کا طوفان جمع تھا۔یہ آنسو اپنی فرقت نصیبی کے آنسو تھے۔

شعر نمبر 2

خون دل کوں کیا تھا میں نیں نوش
اور شیشے میں شراب نہ تھا

نیں = نے
منیں = میں

شاعروں نے شراب نوشی کے بڑے دلچسپ جواز پیش کیے ہیں۔ مثلاً غالب کہتے ہیں:

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

لیکن ولی دوسرا پہلو پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میرے جام میں شراب نہ تھی بلکہ میں نے تو اپنا خون دل پیا تھا۔ ولی کے دور میں شراب کو مذکر استعمال کرتے تھے۔

شعر نمبر 3

آہ پر آہ کھینچتا تھا میں
آج کی رات کچھ حساب نہ تھا

آہ پر آہ کھینچنا = مسلسل آہ وزاری کرنا

شاعر کہتا ہے کہ آج کی رات میرے درد وغم کی کوئی انتہا نہ تھی۔ محبوب سے دوری کے احساس نے مجھے اتنا غمگین بنا دیا تھا کہ میں ہر لمحہ آہیں بھرتا رہا۔ میری ان آہوں کا کوئی شمار نہیں کہ یہ سلسلہ تو ساری رات جاری رہا تھا۔ اس شعر میں شب ہجراں کا تذکرہ موثر انداز میں کیا گیا ہے اور جذباتی لہجہ موجود ہے۔

شعر نمبر 4

کیا سبب تھا خود نہیں آیا
کہ اسے مجھ ستے حجاب نہ تھا

ستے = سے

شاعر کہتا کہ عاشق کو اپنے محبوب کا شدت سے انتظار تھا اسے یہ یقین کامل بھی تھا کہ وہ ضرور آئے گا کیونکہ یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہ تھے۔ پھر، ان کے درمیان کوئی تکلف اور کسی قسم کا حجاب بھی نہ تھا۔ اس حقیقت کے باوجود محبوب نہیں آیا اور یہ بات عاشق کے لیے حیرت کا سبب بن گئی ہے۔ چنانچہ وہ اپنے آپ سے پوچھتا ہے کہ محبوب کے نہ آنے کا سبب شرم تو نہیں ہوسکتی۔ اسے مجھ سے کوئی حجاب نہیں ہے۔ یقیناً اس کے نہ آنے کا سبب کوئی اور بات ہے۔

شعرنمبر5

گلۂ شوخ اے ولی کرنا
ہر کسی کن تجھے صواب نہ تھا

ہر کسی کن = ہر شخص سے

ولی اپنے محبوب کو مختلف ناموں سے یاد کرتے ہیں اور اس لحاظ سے وہ اردو کے دوسرے شعرا سے بہت ممتاز تھے۔ مقطع میں انھوں نے محبوب کو ''شوخ'' کہا ہے۔ اے ولی! اس محبوب شوخ طبع کی ہر جگہ شکایت کرتے پھرنا کسی طرح تمھارے لیے مناسب نہ تھا کیونکہ محبت تو دو دلوں کا راز ہوتی ہے۔ اس میں زمانے والوں کو شامل کرنا غیرت عشق کے منافی ہے۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ محبوب نے جو کچھ کیا شوخی کی وجہ سے کیا، ورنہ جفا اس کے مزاج میں نہیں ہے۔

4۔ خودآزمائی

1۔ غزل اردو شاعری کی مقبول صنف ہے۔مثالوں سے واضح کیجیے۔

2۔ اردو غزل کی تاریخ میں ولی کا مقام و مرتبہ متعین کیجیے۔

3۔ ولی کے حالات زندگی پر نوٹ لکھیے۔

4۔ ولی کی غزل کی بنیادی خوبی سراپا نگاری ہے۔تائید یا تردید کیجیے۔

5۔ صفیر بلگرامی نے ولی کے اشعار کو زبان کے لحاظ سے کتنی اقسام میں تقسیم کیا ہے؟

5۔ مجوزہ کتب برائے مطالعہ

1۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں، اردو غزل، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 1952ء

2۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، ولی اورنگ آبادی، ادارہ ادب و تنقید، لاہور، 1981ء

3۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو (جلد اوّل)، مجلس ترقی ادب، لاہور، 1987ء

4۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، ولی سے اقبال تک، چمن بک ڈپو، دلی، 1985ء

5۔ ولی دکنی، کلیات ولی، مرتبہ نورالحسن ہاشمی، اردو اکادمی لکھنو، 1989ء

یونٹ نمبر3

غزلیاتِ میر

تحریر: ڈاکٹر محمد قاسم
نظرِ ثانی: پروفیسر ڈاکٹر محمد کامران

فہرست

یونٹ کا تعارف

عزیز طلبہ وطالبات

زیرِ نظر یونٹ میں آپ خدائے سخن میر تقی میر کے احوال اور منتخب کلام کا مطالعہ کریں گے۔ میر اردو شاعری کے سرتاج ہیں۔ میر نے قریباً تمام اصناف سخن میں شاعری کی اور اپنے استاد فن ہونے کا لوہا منوایا،لیکن غزل کے میدان میں جو کامیابیاں ان کو نصیب ہوئیں وہ محض انھی کا حصہ ہیں۔ میر کے ہاں آشوب ذات اور آشوب زمانہ کے امتزاج سے ایسی گداختگی ،دردمندی اور آفاقیت پیدا ہوگئی ہے کہ ہر دور کے انسان کو کلام میر کے آئینے میں اپنا پرتو اپنی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ رمزوایمائیت ،اشاریت ،ایجاز واختصار ،ندرت بیان اور جدت خیال کے خوب صورت مرقعوں سے میر کا کلام مزین ہے۔اردو کے تمام بڑے شعرانے میر کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کی شاعرانہ اہمیت وعظمت کا اعتراف کیا۔

یونٹ کے مقاصد

امید ہے کہ اس یونٹ کے مطالعے کے بعد آپ اس قابل ہو سکیں گے کہ:

1۔ میر تقی میر کے احوال زندگی بیان کر سکیں۔

2۔ عہد میر کی سیاسی ومعاشی ابتری کے تناظر میں ان کے کلام کی تفہیم کر سکیں۔

3۔ اردو غزل گو کی حیثیت سے میر کے شاعرانہ مرتبے کا تعین کر سکیں۔

4۔ میر کے منتخب کلام کی شرح وتفہیم کر سکیں۔

1۔میر تقی میر

(1723-1810)

1.1 سوانح

خدائے سخن میر تقی میر آگرہ میں پیدا ہوئے۔اُن کے سن پیدائش کے حوالے سے محققین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔مولوی عبدالحق نے میر کا سال ولادت ۱۱۳۷ھ متعین کیا ہے،جبکہ ڈاکٹر جمیل جالبی کی تحقیق کے مطابق میر کی پیدائش کا سال ۱۱۳۵ھ/۱۷۲۳ء ہے۔

میر کا وطن اکبر آباد جلال الدین اکبر کے زمانے میں ہندوستان کا دالحکومت تھا۔میر کے آبا وَاجداد سرزمینِ حجاز سے ہجرت کر کے دکن پہنچے۔خاندان کے بعض افراد احمد آباد، گجرات میں جا بسے۔میر کے دادا اکبر آباد میں فوجداری کے عہدے پر فائز ہوئے۔میر کے والد علی متقی درویش منش تھے۔میر تقی میر کا اصل نام میر محمد تقی تھا۔ میر نے سات برس کی عمر میں اپنے والد کے نیاز مند سید امان اللہ سے تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔میر کی عمر نو برس تھی جب سید امان اللہ انتقال کر گئے۔اس پر میر کے والد نے خود میر کی تعلیم و تربیت شروع کی لیکن کچھ عرصہ بعد ہی ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ والد کی وفات کے بعد میر کی زندگی مصائب وآلام کا شکار ہو گئی۔ میر روزگار کی تلاش میں دہلی پہنچے اور ایک نواب کے ہاں ملازمت اختیار کر لی۔نواب صاحب ایک جنگ میں مارے گئے تو میر آگرہ واپس آ گئے۔روزگار کا کچھ انتظام نہ ہوا تو دوبارہ دہلی روانہ ہوئے اور اپنے سوتیلے ماموں سراج الدین خان آرزو(میر کے والد کی پہلی شادی خان آرزو کی بہن سے ہوئی تھی) کے ہاں قیام کیا۔میر کے سوتیلے بھائی محمد حسن کے کہنے میں آ کر خان آرزو نے میر کی معاونت سے انکار کر دیا۔اس بے اعتنائی کے باعث میر پر جنون کی کیفیت طاری ہو گئی۔دہلی میں قیام میر کو موافق نہ تھا سو وہ بہتر گزر اوقات کی خاطر لکھنؤ چلے گئے۔لکھنو میں ان کی شاعری کو خوب پذیرائی ملی۔نواب آصف الدولہ کی طرف سے ان کا تین سو روپے ماہوار وظیفہ مقرر ہوا جس سے میر آسودہ حال ہو گئے۔لیکن جلد ہی اپنی زود رنج طبیعت کے باعث کسی بات پر ناراض ہو کر دربار سے الگ ہو کر گھر بیٹھ گئے اور فقر و فاقہ میں وقت کاٹتے رہے۔عمر کے آخری تین سال میر پر بہت کڑے گزرے کیونکہ اس عرصے میں ان کی جوان بیٹی اور بیوی انتقال کر گئیں۔میر اپنی وفات سے چھ ماہ قبل بیمار پڑ گئے اور تادمِ مرگ اس مرض میں مبتلا رہے۔آخر 1325ھ/1810ء میں 87 سال کی عمر میں لکھنؤ میں ہی فوت ہوئے۔میر کا آخری زمانہ دریائے گومتی کے جنوبی کنارے پر واقع ایک محلے میں گزرا۔انہیں اکھاڑہ بھیم میں دفن کیا گیا تاہم امتدادِ زمانہ کے باعث ان کی قبر کے آثار موجود نہیں رہے۔

1.2 عہد میر

میر کا زمانہ سیاسی اعتبار سے طوائف الملوکی کا زمانہ تھا۔برصغیر میں مغل حکومت کمزور پڑ چکی تھی اور برطانوی تسلط قائم ہو رہا تھا۔سیاسی عدم استحکام اور معاشرتی و معاشی مسائل کی وجہ سے عوام کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔میر کی حساس طبیعت پر

ان حالات نے گہرانقش چھوڑااور یہ تمام عناصر میر کی شاعری کی بنیاد بن گئے۔میر کی شاعرانہ قدرت وبصیرت کا اندازہ ان کی تصانیف سے لگایا جا سکتا ہے۔غزلوں کے چھے دیوان، ایک دیوان فارسی، ایک رسالہ بہ زبانِ فارسی، ایک تذکرہ بہ زبانِ فارسی، آپ بیتی، متعدد مثنویاں وقصائد میر کی نوکِ قلم سے تحریر پائے ہیں۔ بہ اعتبارِ ہیئت مثنوی، رباعی، غزل، مستزاد، مخمس، مسدس، ترجیع بند، ترکیب بند، فردیات کی کثیر تعداد میر کے ہاں ملتی ہے۔معاصرین کے مقابلے میں میر کا کلام بہ اعتبارِ فن وفکر انفرادیت کا حامل ہے۔ولی کے تتبع میں پنپنے والی ایہام گوئی کی روایت کی وجہ سے ریختہ گوئی کی روایت کمزور ہو چلی تھی لیکن میر نے لسانی ومعنوی سطح پر اردو غزل کی نئ تشکیل کی۔انہوں نے پرکاری وفن کاری کی بجائے سادگی وسلاست کو غزل کا ایما بنایا۔اس خوبی کی بنا پر غزل خواص تک ہی محدود نہ رہی بلکہ اس تک عوام کی رسائی ہوئی اور یوں میر کا کلام زبانِ زد عام ہو گیا۔

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

میر کے خارجی حالات نے ان کے داخل کی دنیا کو اس قدر متاثر کیا کہ رنج وغم کی کیفیت ان کی شاعری میں حلول کر گئی۔ان کے عہد کی بدنظمی نے ان کی فکر کی تنظیم کی۔میر کے دور میں سماجی زندگی کی سطح انتہائی پست تھی۔امن وامان کا فقدان تھا۔قتل وغارت، لوٹ مار، عصمت دری کے واقعات عام تھے۔معاشی بدحالی سے لوگ بھوکوں مرنے لگے۔افلاس اور قحط کی صورت حال سے اخلاقی اقدار پامال ہو چکی تھیں۔دہلی پر بیرونی حملوں کے ساتھ ساتھ خانہ جنگی بھی جاری تھی جس کی وجہ سے حالات خراب سے خراب تر ہو چلے تھے۔ان حالات میں اچھے بھلے نابغہ روزگار شخصیات کی زندگیوں سے توازن جاتا رہا۔ اہلِ فنون وہنر کی ناقدری وبے وقعتی اس پر مستزاد ٹھہری۔میر نے ان تمام حالات کو اپنی حساس طبیعت کی بنا پر شدت سے محسوس کیا۔ان کی شاعری میں ان کے عہد کے زوال کی تصاویر نظر آتی ہیں۔انہوں نے اپنے اشعار میں اپنے دور کے آلام ومصائب کی عکاسی کی ہے۔میر کی شاعری کا بڑا حصہ ان کے عہد کی متنوع تصاویر پر مبنی ہے جن میں اکثر تصاویر رنگِ یاس، حزن اور غم میں ڈوبی محسوس ہوتی ہیں۔ان نازک موضوعات کو نظم کرتے ہوئے میر نے شاعری کے لوازم کو فکر پر قربان نہیں کیا بلکہ فکر وفن ہر دو اعتبار سے اپنے عہد کی موثر تصویر کشی کی۔اس تناظر میں دیکھا جائے تو میر ایک حزنیہ شاعر کے طور پر سامنے آتے ہیں۔

اب جلتی ہیں وہاں غریب الوطنوں کی لاشیں
ترے کوچے میں مگر سایہ دیوار نہ تھا

سبزان تازہ رو کی جہاں جلوہ گاہ تھی
اب دیکھیے تو واں نہیں سایہ درخت

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

1.3 تصوف

میر کی پرورش صوفیانہ ماحول میں ہوئی اوران کی شاعری پربھی اس ماحول کےاثرات موجود ہیں۔میر کاتصوف کسی الجھے ہوئے فلسفے کا مظہرنہیں بلکہ سادہ وسلیس ہے۔وہ کائنات کےمظاہر میں کائنات کے خالق کاوجودتلاش کرتے ہیں۔وہ عام مشاہدوں سے خاص نتائج حاصل کرتے ہیں۔ان کےتصوف کا عام بیان طبیعاتی سطح کا عکاس ہےاوروہ مظاہرفطرت کو خالق اورمخلوق کے درمیان حائل ایک پردہ قرار دیتے ہیں۔اس کائنات کے ہر ذرے میں خالق کاظہور ہےاوراس پردے کے پیچھے بے بہاحسن ہے جسے ایک عام نظر سہارنہیں سکتی اوراسی واسطے اس پردے کا اہتمام کیا گیا ہے۔میر زندگی کو عام انسان کی نظر سےنہیں دیکھتے بلکہ ان کازاویہ نگاہ وسیع ہے۔

بچپن سےمتصوفانہ ماحول میسرآنے کےطفیل میر کے ہاں ایک خودداری پیدا ہوگئی تھی جوبعض مقامات پرتنک مزاجی میں تبدیل ہوتی محسوس ہوتی ہے۔ترش مزاجی کے سبب انھوں نے نقصان بھی اٹھایا تاہم افلاس کے عالم میں بھی اپنی وضع پر قائم رہے۔وہ اپنی تنگ دستی اورخواری پربھی قانع ہیں۔وہ ہرحال میں خدا کاشکراداکرتے ہیں اور کہتے ہیں:

میر بندوں سے کام کب نکلا
مانگنا ہو جو کچھ خدا سے مانگ

اس باغ کے ہرگل سے چپک جاتی ہیں آنکھیں
مشکل بنی ہے آن کے صاحب نظروں کو

شکرصدشکر کہ میں ذلت وخواری کے سبب
کسی عنوان میں ہم چشمِ عزیزاں نہ ہوا

1.4 تصورِغم

میر کے خارجی حالات وواقعات نے ان کی شخصیت میں غم کا بیج بودیا تاہم ان کے باطن کی دنیا فعال ومتحرک ہے۔میر کی شاعری کا نمایاں موضوع غم ہے تاہم یہ غم میر کی ہستی میں تخریب باعث نہیں بنتا بلکہ ان کی شخصیت کی تعمیر کرتا ہے۔میراپنے اشعار میں غم کی منفی صورت گری نہیں کرتے بلکہ ان کا پیش کردہ تصورِغم ایک مثبت زاویہ فکر کا عکاس ہے۔وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ یہ دنیا غم کی آماجگاہ ہےاور یہاں غم سے فرار ناممکن سی بات ہے۔یہاں وہی کامیاب ہے جوغم سے خوگر ہے۔گویاغم لازمہ حیات ہےاوراس سے چھٹکارانہیں۔اس لیے بجائے اس غم کو بار سمجھنے کے اس کے ساتھ مفاہمت کر لینا زیادہ بہتر ہے۔میر نےغم کواس طرح جزوِحیات بنالیا کہ اس میں لطف محسوس ہونے لگا۔غم کی انتہائی کیفیت میر کے لیے کیف آگیں ہوگئی۔یہاں تک کہ میر نےغم کو اپنی طاقت بنالیا۔غم ان کے لیے تزکیہ نفس کا موجب بن گیا۔غم نے ان کی شخصیت میں ٹھہراو پیدا کردیا۔ ڈاکٹرجمیل جالبی نے میر کےغم کے تناظر میں بہت گہری بات کی ہے:

''میر کا غم انسانی آرزوؤں کی شکست، تنہائی کے احساس اور زندگی کے سمندر میں فرد کی بے چارگی اور موت کے سامنے اس کی بے مائیگی کے شعور سے پیدا ہوا ہے۔غم کا یہ انداز غم کو زندگی کا ایک اٹوٹ حصہ سمجھنے سے پیدا ہوا ہے۔اسی لیے میر کے غم میں تلخی، بیزاری اور زہر بھری یاسیت کے بجائے صبر، تسلیم و رضا اور جہاں بینی کا احساس ہوتا ہے۔اتنے پہاڑ جیسے غموں کے باوجود میر کی بڑی عمر کا راز یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری سے خود اپنے غموں کا تزکیہ کیا ہے اور یہی تزکیاتی اثر میر کی شاعری پڑھنے والے پر اثر ہوتا ہے۔بڑی شاعری میں غم کی نوعیت ہمیشہ مثبت ہوتی ہے۔''

(تاریخ ادب اُردو، جلد دوم، مجلس ترقی ادب کلب روڈ، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۵۸۵۔۵۸۶)۔۔

میر کو درپیش حالات و حوادث بشمول غریب الوطنی، فکرِ معاش، اپنوں کی بے اعتنائی، فن کی ناقدری، غمِ عاشقی و غمِ زمانہ، آرزوؤں کی پامالی اور ان پر مستزاد حساس و زود رنج طبیعت نے میر کی شخصیت کو خوب تراشا۔میر آزمائش کی بھٹی میں تپ کر کندن ہو گئے۔وہ ایک ایسا سانچہ بن گئے کہ غم میں جس میں آ کر ان کی منشا کے مطابق ڈھل جاتا ہے۔وہ اس غم سے اپنی ہستی کی تعمیر بھی کرتے ہیں اور اس سے اپنی شاعری بھی سنوارتے ہیں۔

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
دل کے جانے کا نہایت غم رہا

مصائب اور تھے پر جی کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

میر کی شخصیت میں غم کے مذکورہ بالا سفر کے تناظر میں وہ غمِ ذات سے ہوتے ہوتے غمِ حیات اور پھر کائنات میں پھیلے عناصرِ غم تک جا پہنچتے ہیں۔ان کا دائرۂ غم ذاتی اور معاشرتی دونوں غموں پر محیط ہے۔غم ان کے ہاں یاسیت نہیں بلکہ ترفع کا باعث ہے۔یہ غم قنوطیت کی بجائے نشاطیہ کیفیت کا مظہر ہے۔یہ غم، غمِ ذات کی حدود سے متجاوز ہو غمِ کائنات تک پھیل جاتا ہے اور ہر کس و ناکس کے انفرادی غم کو اپنے اندر سمو لیتا ہے۔فطرت انسانی کے عین مطابق کہیں کہیں میر حوادثِ زمانہ کے آگے بے بس نظر آتے ہیں۔ایسے میں ان کے کلام میں تڑپ، کسک، محرومی، ناکامی و نارسائی جیسے عناصر نمایاں ہونے لگتے ہیں۔یہ عناصر میر کے غم کی پختہ صورت گری پختہ کرتے ہیں یہاں تک کہ میر کے غم کا آفاقی پیرایہ اختیار کر لیتا ہے۔

یہ عیش گاہ نہیں ہے یاں رنگ اور کچھ ہے
ہر گل ہے اس چمن میں ساغر بھرا لہو کا

میر جنگل پڑے ہیں آج جہاں
لوگ کیا کیا یہیں تھے کل بستے

1.5 تصورِ عشق

یوں تو عشق اردو شاعری کا روایتی موضوع ہے اور میر نے بھی اس موضوع کو نظم کیا تاہم میر کے ہاں یہ موضوع روایت نہیں بلکہ عملی تجربے کی دین ہے۔ میر کا عشق مجاز اور حقیقت ہر دو رنگوں سے مزین ہے۔ جہاں تک عشقِ مجازی کا تعلق ہے تو میر کا عشق روایتی عشق نہیں جس میں فقط ظاہری رنگینی و شوخی ہی موجود ہو بلکہ ان کا عشق خارجی کیفیات کی بجائے باطنی سطح کو متاثر کرتا ہے۔ میر کا عشق کھل کر سامنے نہیں آتا بلکہ محجوب ہے۔ میر کا عشق ان کی شخصیت کی تہذیب کرتا ہے، انہیں ادب آداب سکھلاتا ہے یہاں تک کہ اگر انہیں محبوب سے شکوہ بھی ہو تو وہ اس پر سیخ پا ہونے کی بجائے ایک حزنیہ آہ بھر کر رہ جاتے ہیں۔ جذبہ عشق نے میر کی زندگی میں تحریک پیدا کی ہے اور انہیں فعال کر رکھا ہے۔ میر کو اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ عشق کی راہ مشکل ہے اور اس راستے کے مسافر میں ہمت اور حوصلہ ہونا لازم ہے تاہم وہ ان مشکلات کو جھیلنے کا ظرف رکھتے ہیں۔ میر کے تصورِ عشق کو سمجھنے کے لیے ایک مجسم محبوب کا تصور ضروری ہے کیونکہ اس تصور سے ہی میر کے احساسِ جمال، قوتِ تخیل اور تصورِ حسن پر روشنی پڑتی ہے۔ ان کا محبوب خود حسن و نور کا منبع ہے اور روشنی کی طرح شفاف ہے۔ میر کا محبوب صرف روشنی ہی نہیں بلکہ جسم، خوشبو اور رنگ و بو کا پیکر بھی ہے۔ وہ مادی کثافتوں سے پاک ہے۔ میر کی شاعری احساسِ حسن اور ذوقِ جمال کے گرد گھومتی ہے:

ان گل رخوں کی قامت لہکے ہے یوں ہوا میں
جس رنگ سے لچکتی پھولوں کی ڈالیاں ہیں

میر کے غم کی طرح میر کا عشق بھی ان کے باطن سے نکل کر خارجی دنیا تک پھیل جاتا ہے۔ میر کے نزدیک محبت ایک وجود تک محدود نہیں بلکہ ہر وجود میں محبت ہے۔ وہ پوری کائنات کو ہی عشق کا مظہر سمجھتے ہیں۔ میر کو زمانے میں ہر طرف عشق اور محبت کے فسانے بکھرے نظر آتے ہیں۔ جنوں کی کیفیت اس پر مزید کاری گزرتی ہے۔ عشق اور جنون دونوں نے میر کی زندگی کو بہت متاثر کیا۔ وہ ان دونوں عناصر کے دام سے تاحیات نہ نکل سکے۔ میر کا عشق مبہم نہیں بلکہ اتنا واضح ہے کہ اپنے وجود کا بخوبی احساس دلاتا ہے۔ غم ہی کی طرح عشق بھی میر کے جسم و جاں میں سرایت کر چکا ہے۔ جس طرح غم میر کے زاویہ نظر کو وسعت بخشتا ہے اسی طرح عشق بھی میر کے جذبات کو وسعت دے کر انہیں عشقِ مجاز سے عشقِ حقیقی کے راستے کا مسافر بناتا ہے۔ میر کی نے تمام زندگی محبت کی اور اس سے ملنے والی ناکامیوں کو جزوِ حیات سمجھ کر قبول کیا۔

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

میر کے ہاں محبت میں نباہ اور سلیقے سے زیست کرنا قابلِ غور ہیں۔ میر نے یہ وضع عشق سے پائی ہے۔ ان کی عشقیہ

شاعری میں جسم اور روح کی آنچ دونوں موجود ہیں لیکن ان کا کمال یہ ہے کہ وہ نہ تو جسم کے پیچ وخم میں اسیر ہو کر رہ جاتے ہیں اور نہ محض حسن سے ایک روحانی رشتہ کافی سمجھتے ہیں۔ اگر میر کے یہاں صرف شباب کے ہیجان کی داستان ہوتی تو ان کی شاعری لازوال نہ ہوتی۔ میر کے ہاں عشق کی دان کردہ وضع جنون بن گئی ہے اور اس جنون میں عاشقی ہی نہیں زندگی کی کچھ دیگر اہم اقدار بھی شامل ہیں۔

1.6 محاسن کلام

فنی اعتبار سے بھی میر کی شاعری اپنی مثال آپ ہے۔ ان کے کلام میں تشبیہ واستعارہ کا استعمال بڑی عمدگی سے ملتا ہے۔ یہ تشبیہات روایتی اور غیر فعال نہیں بلکہ متحرک ہیں اور قاری کو دعوتِ فکر دیتی ہیں۔ میر کی تشبیہات بناوٹ سے پاک ہیں:

بس اے میر مژگاں سے پونچھ آنسوؤں کو
تو کب تک یہ موتی پروتا رہے گا

میر کی شاعری غنائیت وموسیقیت کا عمدہ نمونہ ہے۔ بحروں کا موزوں انتخاب ان کے کلام میں نغمگی پیدا کرتا ہے۔ ان کے کلام میں صنائعِ لفظی ومعنوی کی دلکش مثالیں موجود ہیں۔ میر کی شاعری ایک مخصوص اور منفرد انداز کی حامل ہے۔ صنائع بدائع کے مشاقانہ استعمال کے ساتھ ساتھ میر نے لسانی سطح پر اردو زبان کو اس مقام تک پہنچایا کہ اردو شاعری مکمل اعتماد کے ساتھ فارسی شاعری کے مقابل آ گئی۔ میر نے ایک گری پڑی زبان کو اظہار کے جملہ قرینوں سے بہرہ مند کیا۔ میر کا کلام بعد کے شعرا کے لیے نمونہ بن چکا ہے اور ہر دور کے شعرا نے ان کے کلام سے فیض اٹھایا ہے۔ تغزل کو جس کامیابی اور خوش اسلوبی سے میر نے نبھایا ہے، وہ ان ہی کا کمال ہے۔ احساس کی شدت، تجربے کی گہرائی، مضامین کی شدت، آلامِ روزگار اور غمِ عشق جیسے عناصر نے مجتمع ہو کر میر کی غزل گوئی کو اس طرح بے مثال بنا دیا ہے کہ پھر کسی شاعر کے ہاں فکر وفن کی یہ پختگی یکجا نہیں ملتی۔ ان حقائق کے تناظر میں دیکھا جائے تو میر کو بجا طور پر خداوندِ سخن کہا جاتا ہے۔ میر کو اپنے مقام ومرتبے کا خوب احساس ہے اس لیے اپنے حوالے سے خود کہتے ہیں:

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ
مدت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

2۔ اہم نکات

1۔ میر کا عہد سیاسی، سماجی اور معاشرتی اعتبار سے ناپائیداری کا زمانہ تھا۔

2۔ میر کی شاعری اپنے عصری آشوب کا آئینہ ہے۔

3۔ میر نے لسانی اور معنوی سطح پر اردو شاعری کو فارسی شاعری کے مقابل کھڑا کر دیا۔

4۔ میر کے ہاں کائنات کی تفہیم کے تناظر میں ایک مخصوص صوفیانہ زاویہ نگاہ دکھائی دیتا ہے۔

5۔ میر کے ہاں عشق دراصل آداب زندگی کا قرینہ ہے اور تحرک کا استعارہ ہے۔

6۔ میر کا غم ذاتی سے زیادہ کائناتی ہے۔

7۔ میر کی شاعری ایک تزکیاتی اثر رکھتی ہے۔

3۔ تشریحات

3.1 غزل:1

جب نام ترا لیجیے تب چشم بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے
مے خانہ وہ منظر ہے کہ ہر صبح جہاں شیخ
دیوار پہ خورشید کا مستی سے سر آوے
کیا جانیں وے مرغان گرفتار چمن کو
جن تک کہ بصد ناز نسیم سحر آوے
تو صبح قدم رنجہ کرے ٹک تو ہے ورنہ
کس واسطے عاشق کی شب غم بسر آوے
اے وہ کہ تو بیٹھا ہے سر راہ پہ زنہار
کہیو جو کبھو میر بلاکش ادھر آوے
مت دشتِ محبت میں قدم رکھ کہ خضر کو
ہر گام پہ اس راہ میں سفر سے حذر آوے

شعر:1

جب نام ترا لیجیے تب چشم بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

شاعرمحبوب سے مخاطب ہوکر کہتا ہے کہ اس کا نام لیتے ہی شاعر کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔محبوب نے جورو جفا کا جورویہ اپنا رکھا ہے اس کے سبب یہ حال ہوگیا ہے کہ فقط محبوب کا نام لینے سے ہی ستم گری کے تمام معانی شاعر پر کھلنے لگتے ہیں۔شاعر کہتا ہے کہ جب محبوب کے نام سے ہی درد کا احساس جڑا ہو،محبوب کا نام بجائے راحت دینے کے رنج فزا ہو۔ ایسی زندگی گزارنے کو حوصلہ درکار ہے اور شاعر اتنا حوصلہ کہاں سے لائے؟ شاعر کا اتنا جگر،اتنی ہمت نہیں کہ وہ اس قدر ستم برداشت کر سکے سو اس طرز کی زندگی گزارنا اس کے بس کا روگ نہیں اور اسی لیے وہ محبوب سے اس مسئلے کا حل دریافت کرتا ہے۔

شعر:2

مے خانہ وہ منظر ہے کہ ہر صبح جہاں شیخ
دیوار پہ خورشید کا مستی سے سر آوے

خورشید: سورج

اس شعر میں صنعتِ حسنِ تعلیل ہے۔ واعظ کا ہمیشہ سے یہی چلن رہا ہے کہ وہ بادہ خواروں کو مے خانے کی زیارت پر روک ٹوک کرتا ہے اور فتوے سناتا ہے لیکن بادہ خوار ہیں کہ مے خانے کی عظمت بیان کیے چلے جاتے ہیں۔ یہاں شاعر حضرت ناصح کی ایسی ہی کسی نصیحت پر مے خانے کی حرمت ثابت کرنے کے لیے جواب دیتا ہے کہ اے شیخ! مے خانہ ایسی بھی خراب جگہ نہیں کہ ہر وقت اس کے ذکر پر کوسنے ہی سنائے جائیں۔ مے خانہ تو ایسی مبارک جگہ ہے کہ جس کی دیوراوں پر سورج کی کرنیں پڑتی ہیں تو سورج بھی بدمست ہو جاتا ہے۔ ایک طرف سورج خود تمام جہان کے لیے روشنی بانٹنے کا کام کرتا ہے تو دوسری طرف اسی سورج کو کچھ پل کی بےفکری اور سرمستی کا موقع فراہم کرنے والا یہ مے خانہ ہے۔ گویا مے خانہ کئی ذمہ دار اور کارِ جہاں میں الجھے عناصر کے لیے لمحہ بھر کی وہ تفریح ہے جس سے ان کاموں کا بوجھ ہلکا محسوس ہونے لگتا ہے۔ مے خانے جا کر ہستی کا بار کم ہونے لگتا ہے اور بادہ خوار ان حقیقتوں کو جو اصلاً بہت تلخ ہوتی ہیں، پیالے میں گھول کر پی جاتا ہے۔ اس تناظر میں دیکھیں تو مے خانہ جائے ملامت نہیں بلکہ جائے پناہ محسوس ہوتا ہے۔

شعر:3

کیا جانیں وے مرغانِ گرفتار چمن کو
جن تک کہ بصد ناز نسیمِ سحر آوے

قفس میں قید پرند صبح شام اپنی اسیری پر روتے رہتے ہیں کہ آزادی کی کوئی صورت بن نہیں پاتی اور قید بھی وہ کہ جو عین چمن میں ہو، ان کے دکھ میں مزید اضافہ کر دیتی ہے۔ ان کا قفس کہیں چمن سے دور ہوتا تو فقط اسیری کا دکھ ہوتا لیکن یہاں باغ کے بیچوں بیچ آنکھ سے پرے کے سارے مناظر زخموں کی شدت میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ دیگر پہر تو خیر جیسے تیسے کٹ جاتے ہیں لیکن وقتِ سحر کاٹنا بہت مشکل ہے کہ جب صبح کی ٹھنڈی ہوا کی جھونکے قفس کی سلاخوں کے بیچوں بیچ سے گزر کر ان اسیروں کا گھروندا پار کر جاتے ہیں اور یہ پرندے اڑان کی فقط خواہش لے کر قفس میں ہی اس نسیم سحر کو محسوس کرتے ہیں، پروں میں ہوا بھرتے ہیں اور پر پھڑ پھڑا کر رہ جاتے ہیں۔ ان کے لیے نسیمِ سحر کی ناز وادا کوئی معنی نہیں رکھتی بلکہ ایک محرومی کا احساس ہے کہ جو اس مشامِ قاتلانہ سے وابستہ ہے۔ وہ پرندے جو آزاد اڑان بھر سکتے ہیں اور صبح کی ہوا سے لطف لے سکتے ہیں ان کو قیدی پرندوں کے آزار کا اندازہ کبھی نہیں ہو سکتا۔

شعر:4

تو صبح قدم رنجہ کرے ٹک تو ہے ورنہ
کس واسطے عاشق کی شبِ غم بسر آوے

ٹک: ایک پل، لحظہ بھر

محبوب کی بڑی نوازش ہے کہ وہ عاشق کے ہاں بوقتِ صبح آن ٹھہرتا ہے کہ اسی سہارے تو عاشق غم کی رات بسر کرتا

ہے۔اگر عاشق کو یہ سہارا بھی نہ ہو کہ صبح ہونے پر محبوب سے ملاقات کا امکان ہے تو اس کی شبِ غم تو پھر کبھی نہ گزر سکے۔ یہ تصورِ محبوب ہی ہے کہ جو عاشق کے حوصلے کو بلند رکھتا ہے اور وہ غم کے مارِ سیاہ سے مقابلہ کر کے سحر کرتا ہے۔محبوب کا پل دو پل کا آ ملنا ہی عاشق کو بہت ہے، زیادہ کی طلب ہی نہیں کہ یہ ایک پل کی ملاقات ہی اس کے لیے وصل کے احساس سے بھرپور ہے۔ عاشق پہ محبوب کی یہی عنایت بہت ہے کہ اس نے صبح کی گھڑی بھر کی ملاقات سے اس کی شب رفتگی کا صلہ بخش دیا ہے، اب اسی حوصلے پر عاشق آئندہ بھی شبِ غم گزار لے گا اور آئندہ بھی یہی ایک پل کی ملاقات اس کے لیے زادِ شب ٹھہرے گی۔

شعر:5

اے وہ کہ تو بیٹھا ہے سر راہ پہ زنہار
کہیو جو کبھو میر بلاکش ادھر آوے
مت دشتِ محبت میں قدم رکھ کہ خضر کو
ہر گام پہ اس راہ میں سفر سے حذر آوے

زنہار: کلمۂ تنبیہ

مسلسل مفہوم کے حامل اس قطعہ کے پہلے شعر میں شاعر سرِ راہ بیٹھے شخص کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ اے فلاں! تم خود تو عشق کے ہاتھوں گھر بار چھوڑ کر رستے پہ آ ہی بیٹھے ہو، اور جو مصیبت کا مارا میر اس طرف سے گزرے تو اسے اس دشتِ الفت میں قدم رکھنے سے روک لینا۔ بھلے وہ یعنی میر تکالیف ومصائب کو برداشت کرنے کا ہنر رکھتا ہے لیکن عشق ایسا سراب ہے کہ جو مسافر نگل لیتا ہے۔سو میر کو تاکید لازم ہے کہ وہ باز رہے۔دوسرے شعر میں شاعر تنبیہ کرتا ہے کہ دشتِ محبت میں قدم رکھنا کسی مصیبت سے کم نہیں۔ یہ تو وہ راہِ پرخطر ہے کہ جہاں خضر جیسی برگزیدہ ہستی کو بھی سفر کرنے میں دقت پیش آتی ہے تو میر کی تو وقعت ہی کیا ہے۔

3.2۔ غزل:2

اس عہد میں الٰہی محبت کو کیا ہوا
چھوڑا وفا کو ان نے مروت کو کیا ہوا
امیدوار وعدہ دیدار مر چلے
آتے ہی آتے یارو قیامت کو کیا ہوا
اس کے گئے پر ایسے گئے دل سے ہم نشیں
معلوم بھی ہوا نہ کہ طاقت کو کیا ہوا

بخشش نے مجھ کو ابر کرم کی کیا خجل
اے چشم، جوش اشک ندامت کو کیا ہوا
جاتا ہے یار تیغ بکف غیر کی طرف
اے کشتہ ستم تری غیرت کو کیا ہوا
تھی صعب عاشقی کی بدایت ہی میر پر
کیا جانیے کہ حال نہایت کو کیا ہوا

شعر:1

اس عہد میں الٰہی محبت کو کیا ہوا
چھوڑا وفا کو ان نے مروت کو کیا ہوا

شاعر حیران اور پریشان ہو کر خدا کے سامنے عرضِ حال کرتا ہے کہ یا الٰہی! اس دور میں محبت کو کیا ہو گیا ہے؟ محبت کا رنگ روپ، چہرہ مہرہ، لب ولہجہ کیوں بدل گیا ہے؟ محبت تو شیوہ آدم اور فطرتِ انسان ہے اور یہی محبت انسان کی پہچان بھی ہے، پھر اس میں تبدیلی کیسے آ گئی ہے؟ محبوب نے تو اس ذیل میں خیر حد کر دی ہے، وفا کو چھوڑ کر جفا کا طریقہ اپنا لیا ہے اور مروت کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ اب بندہ محبت کی اجتماعی موت کو ایک طرف روئے اور محبوب کی سنگدلی کو دوسری طرف، یہ مقامِ حیرت نہیں تو اور کیا ہے؟ جفا اور ستم کے اس رویے نے شاعر کو مقدمِ عشق خدا کے حضور پیش کرنے پر بے اختیار کر دیا ہے جبھی وہ اپنے سارے سوال خدا سے پوچھتا ہے کیونکہ اب بندگانِ خدا اس کا جواب دینا روا نہیں سمجھتے۔

شعر:2

امیدوار وعدہ دیدار مر چلے
آتے ہی آتے یارو قیامت کو کیا ہوا

محبوب کا دیدار عشاق کے لیے کسی قیامت سے کم نہیں۔ عشاق منتظر ہیں کہ کب انہیں محبوب کا جلوہ نصیب ہوگا۔ وہ سراپا انتظار ہیں۔ لیکن محبوب کی سرشت میں ہے کہ وہ عشاق کو انتظار کرواتا رہتا ہے۔ ادھر عشاق ہیں کہ مشتاقِ حشر ہیں، محبوب کے دیدار کے منتظر ہیں۔ محبوب نے ان سے دیدار کا وعدہ کر رکھا ہے سو انہیں امید ہے کہ ان کا انتظار اکارت نہیں جائے گا۔ وہ اسی وعدے اور اسی امید کے سہارے انتظار کی گھڑیاں کاٹتے رہتے ہیں یہاں تک کہ ان کی حالت غیر ہو جاتی ہے۔ انتظار کی گھڑیاں طویل ہو جاتی ہیں اور محبوب کی دید کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو عشاق پر مردنی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ انتظار کی شدت اور ہجر کی کیفیت سے یہ حالت ہو جاتی ہے گویا عشاق کا دم اب نکلا کہ تب۔ آخری مصرعے میں ذومعنویت ہے۔ ایک طرف اگر محبوب کا جلوہ قیامت خیز ہے تو دوسری جانب عشاق انتظار سے نیم جاں ہیں اور اپنے لیے قیامت کے طالب ہیں یعنی قیامت آئے اور ان کی جان انتظار کے آزار سے چھوٹ جائے۔ لیکن ان کی قسمت میں مسلسل انتظار ہے کہ نہ تو

وہ مر رہے ہیں اور نہ ہی محبوب کا دیدار نصیب ہو رہا ہے۔

شعر:3

اس کے گئے پر ایسے گئے دل سے ہم نشیں
معلوم بھی ہوا نہ کہ طاقت کو کیا ہوا

شاعر اپنے غم خوار کو اپنی روداد سناتے ہوئے کہتا ہے کہ ایک تو وہ (یعنی شاعر) محبوب کے دل سے رخصت ہوا اور پھر ایسے رخصت ہوا جیسے اس کی تمام طاقت ختم ہو چکی ہو گویا نیم جاں ہو۔ محبوب کے حکم کے سامنے شاعر کی کوئی طاقت کام نہ آئی۔ شاعر کو محبوب کے دل سے اذنِ سفر ملا سو اس نے چپ چاپ رخت سفر باندھا اور وہ بستی چھوڑ دی کہ جس کا کونہ کونہ اس نے اپنی الفت سے آباد کیا تھا۔ محبت سے بسائی گئی بستیوں کو چھوڑنا بہت مشکل ہوتا ہے لیکن کیا کیا جائے کہ محبوب کے حکم کی سرتابی کی مجال شاعر میں نہ تھی۔ شاعر حیران ہے کہ اس کے پاس تو محبت جیسی عظیم طاقت تھی لیکن عین موقع پر کہ جب اس طاقت کو استعمال کرنے کا وقت آیا، معلوم نہیں یہ طاقت کہاں کھو گئی اور شاعر چپ چاپ بنجارا ہو گیا۔

شعر:4

بخشش نے مجھ کو ابر کرم کی کیا خجل
اے چشم، جوش اشک ندامت کو کیا ہوا

خجل: نادم، شرمندہ

شاعر نے خواہشِ وصل اور صدماتِ فرقت کے تحت تمام عمر روتے روتے گزار دی یہاں تک کہ وصل کا لمحہ آ پہنچا۔ محبوب کی جانب سے التفات کا بادل برس پڑا۔ محبوب اس قدر ملتفت ہو چلا کہ شاعر کو خجالت محسوس ہونے لگی۔ شاید یہ ان آنسوؤں کا نتیجہ تھا کہ محبوب کے کرم کا بادل جھوم جھوم برسا۔ شاعر کو محبوب سے اس بخشش کی قطعی توقع نہ تھی۔ وہ اس غیر متوقع عنایت پر محبوب کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ لیکن افسوس کہ وقتِ بخشش وہ اس مہربانی کا شکریہ ادا ہی نہ کر سکا۔ وہ شکرانے کے طور پر اپنے محبوب کو آنسوؤں کا تحفہ دینا چاہتا تھا لیکن عین وقت پر اسے معلوم ہوا کہ اس کی آنکھوں کے سوتے خشک ہو گئے ہیں۔ وہ تمام عمر روتا رہا ہے لیکن اب محبوب کے روبرو وہ رونے سے قاصر ہے۔ ایسے میں وہ بے بسی سے اپنی ہی آنکھوں سے سوال کہ کرتا ہے کہ وہ اشکِ ندامت کا جوش کہاں رہ گیا کہ جواب دیکھنا مطلوب ہے؟ اس کے اشکوں کی وہ طغیانی کیا ہوئی کہ جس سے وہ محبوب کو اپنی محبت کا احساس دلا سکتا تھا۔ افسوس کہ شاعر جس جوشِ اشک کو اپنی طاقت سمجھتا تھا وہ وقت پڑنے پر شاعر کے ندامت کے احساس کے اظہار سے قاصر ہو جاتا ہے۔

شعر:5

جاتا ہے یار تیغ بکف غیر کی طرف
اے کشتہ ستم تری غیرت کو کیا ہوا

تیغ بہ کف: تلوار اٹھائے ہوئے

کشتہ ستم: ستم اور ظلم سہہ سہہ کر مٹ جانے والا

یوں تو محبوب کا معمول ہے کہ وہ اپنے ستم کے تمام تیر شاعر پر آزماتا ہے لیکن اب کے صورت حال کچھ بدلی ہوئی ہے۔ محبوب آستیں میں خنجر چھپائے غیر یعنی رقیب کی طرف جا رہا ہے اور شاعر کو یہ بات بالکل گوارا نہیں۔ وہ نہیں چاہتا کہ رقیب سے محبوب کا کوئی بھی تعلق ہو خواہ وہ ستم کا ہی تعلق کیوں نہ ہو؟ وہ اپنے کشتہ ستم، اپنی قوتِ برداشت کی غیرت کو جھنجھوڑتا ہے کہ کیا اب یہاں اتنی بھی ستم پروری کی گنجائش باقی نہیں رہی کہ محبوب کے غیض وغضب کو پہلے کی طرح سہار لیا جائے۔ یہ نوبت کیوں آ گئی ہے کہ محبوب اب رقیب کو جا کے تختِ ستم بنائے؟ محبوب کو رقیب کے ہاں جانے ہی کیوں دیا جائے۔ اس کی تمام ادا ہائے دلبرانہ وقاتلانہ کو خود ہی کیوں نہ برداشت کیا جائے؟ شاعر خود پہ متاسف ہے کہ محبوب کو کوچہ غیر میں جانے کی زحمت ہی کیوں ہوئی اسی لیے وہ خود پر برہم ہے۔ وہ جور و ستم کی انتہا کے باعث نڈھال ہے اور خود پر متاسف ہے۔

شعر:6

تھی صعب عاشقی کی بدایت ہی میر پر
کیا جانیے کہ حال نہایت کو کیا ہوا

صعب: صعوبت، تکلیف

بدایت: ابتدا، آغاز

نہایت: انتہا، انجام

شاعر کہتا ہے کہ عاشقی میں صعوبتوں اور تکالیف کو برداشت کرنے کی ابتدا میر سے ہی ہوئی۔ اس سے قبل بھی عشق کی راہگزر میں ظلم و ستم کی روایت گزری ہوگی لیکن جس قدر میر کو غم اور تکلیف سے علاقہ رہا اس کی مثال اس سے قبل نہیں ملتی۔ میر نے تو اس ذیل میں برداشت کی وہ مثال قائم کی کہ اس کے بعد سے عشق کے میدان میں جور و جفا محبوب کا حق ٹھہرا اور اوران انداز ہائے ظالمانہ کو برداشت کرنا عاشق پر فرض ہوا۔ اب جبکہ میر نے ایک روایت کی بنا ڈالی تو وہ یہ جاننے کا بھی متمنی ہے کہ اس روایت کی پرداخت کہاں تک ہوئی؟ ابتدا میں تو میر نے کارِ عشق میں بہت پامردی دکھائی۔ لیکن اس کی انتہا نا معلوم کیا ٹھہری؟

3.3۔ غزل:3

بیتاب جی کو دیکھا دل کو کباب دیکھا
جیتے رہے تھے کیوں ہم جو یہ عذاب دیکھا
پودا ستم کا جس نے اس باغ میں لگایا
اپنے کیے کا ان نے ثمرہ شتاب دیکھا

دل کا نہیں ٹھکانا بابت جگر کی گم ہے
تیرے بلاکشوں کا ہم نے حساب دیکھا
آباد جس میں تجھ کو دیکھا تھا ایک مدت
اس دل کی مملکت کو اب ہم خراب دیکھا
یوں خاک میں ملایاں اس بن کہ کچھ نہ پوچھو
اس ظلم دیدہ دل کا ہم اضطراب دیکھا
لیتے ہی نام اس کا سوتے سے چونک اٹھے
ہے خیر میر صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا

شعر:1

بیتاب جی کو دیکھا دل کو کباب دیکھا
جیتے رہے تھے کیوں ہم جو یہ عذاب دیکھا

شاعر اپنی حالتِ زار پہ افسوس کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میرا جی ہمیشہ بے تاب رہا ہے، بے سکونی میری ذات کا حصہ رہی ہے، بے چینی مرے اندر گھر کر گئی ہے، ایک عجب اضطراب ہے کہ پوری طبیعت میں موجود ہے۔ دل ہے کہ ہمیشہ جلا بجھا رہتا ہے گویا کباب ہو۔ سوختگی اس دل کا مقدر ہے اور کوئی لمحہ لطف نہیں کہ جو اس بے کیفی کو بدل ڈالے۔ جب زندگی میں کوئی راحت ہی نہیں تو اس جینے کا کیا فائدہ جس میں عذاب ہی عذاب پیشِ نظر رہے۔ اس سے بہتر ہے کہ زندگی سے کنارہ کر لیا جائے لیکن ہائے قسمت کہ وہ بھی انسان کے اختیار میں نہیں۔ ایسے میں فقط جی پر، دل پر اور زندگی پر افسوس ہی بنتا ہے کہ جو شاعر جی بھر کر کرتا ہے۔ اسی مضمون کو میر نے ایک اور جگہ یوں بیان کیا ہے:

آتش غم میں دل بھنا شاید
دیر سے بو کباب کی سی ہے

شعر:2

پودا ستم کا جس نے اس باغ میں لگایا
اپنے کیے کا ان نے ثمرہ شتاب دیکھا

ثمرہ: پھل

شتاب: جلد

شاعر اس دنیا کو باغ سے مماثل قرار دیتے ہوئے کہتا ہے کہ جو شخص بھی اس باغ یعنی دنیا میں ستم کا پودا لگاتا ہے اس کے لگائے پودے پہ فوراً پھل آ جاتا ہے۔ ستم ایک ایسا فعل ہے جس کے مقابل دو طرح کے رویے سامنے آتے ہیں۔۔ اولاً

ستم برداشت کرنا اور دوسرے ستم کے بدلے ستم کرنا۔ اول صورت میں ستم گر کی خوئے ستم گری شہہ پکڑتی ہے اور وہ اس بابت مزید شیر ہو کر ستم کا فعل روا رکھتا ہے۔ دوسری صورت میں بجائے خود ستم گری بڑھ جاتی ہے۔ یعنی ہر دو صورتوں میں خرابی کی شرح بڑھتی ہی ہے اور دنیا میں ستم کے بوٹے سے بڑھ کر کوئی بوٹا اس قدر تیزی سے ثمر آور نہیں ہوتا۔ شعر میں مستعمل الفاظ پودا، باغ، ثمرہ میں ایک خاص مناسبت ہے جو مراۃ النظیر کی مثال ہے۔

شعر:3

دل کا نہیں ٹھکانا بابت جگر کی گم ہے
تیرے بلاکشوں کا ہم نے حساب دیکھا

بلاکش: مصائب برداشت کرنے والا

جور و ستم میں محبوب کو ملکہ حاصل ہے اور جو اس کے ستم کے وار سہتے ہیں ان کا تو حساب ہی الگ ہے۔ محبوب کے ستم رسیدہ بدحال ہو جاتے ہیں، ان کے دل اس قدر بے سکون ہو جاتے ہیں کہ کہیں چین نہیں پاتے، ان کے جگر میں اتنا یارا ہی نہیں رہتا کہ ستم مزید برداشت کر سکیں۔ محبوب کی ادائیں بہت سفاک اور مہلک ہیں۔ جو محبوب کے ستم کا شکار ہوا پھر وہ کبھی جانبر نہ ہوا۔ جو زخم محبوب دیتا ہے ان کی تاب لانا آسان نہیں۔ شاعر ان غم کے ماروں کا شاہد ہے۔ وہ ان کی بدحالی کو خوب سمجھ سکتا ہے کہ شاید خود اس کا شمار بھی ان بلاکشوں میں ہوتا ہے جو محبوب کے جور و ستم کا کشتہ ہیں۔ یہی بلاکشی ان کے دل کو بے ٹھکانہ کر دیتی ہے اور جگر کی استعداد کو کم کر دیتی ہے۔ یعنی عشاق کارگاہِ عشق میں دل و جگر اور ہوش و حواس سب رخصت کر بیٹھے ہیں۔

شعر:4

آباد جس میں تجھ کو دیکھا تھا ایک مدت
اس دل کی مملکت کو اب ہم خراب دیکھا

ایک عرصے تک محبوب کی ذات نے شاعر کے دل کی انجمن کو آباد کیے رکھا۔ شاعر کے دل کی بستی میں یہاں سے وہاں تک محبوب کا فروزاں وجود باقاعدہ نظر آتا تھا۔ شاعر کے دل کی حیثیت کسی سلطنت سے کم نہ تھی کہ جس کی بادشاہت کا تاج محبوب کے سر تھا۔ لیکن افسوس کہ اس خطہ دل کی آبادی کی یہ کوشش یک طرفہ تھی، شاعر نے سارے اختیارات محبوب کو دے رکھے تھے لیکن اس نے ان اختیارات کا ناجائز فائدہ اٹھایا اور محبوب کے دل کو اجاڑ ڈالا۔ شاعر کے مقدس دل میں بس کر بھی محبوب نے اپنی خوئے بد نہ چھوڑی اور الٹا اس دل کو بھی خراب کر ڈالا۔ شاعر پریشان بیٹھا ہے کہ اب اس خرابی کا تدارک کیونکر ہو سکتا ہے؟ جس شخص کو اس نے ایک عرصے تک دل کی آبادی اور تعمیر کا کام سونپا تھا اس نے تو دل کی بربادی اور تخریب کا کام کیا۔ ایسے میں شاعر کے دل کی حالت زار ایک اجڑی مملکت کے سوا کچھ نہیں رہتی اور شاعر ہے کہ بے بسی میں اس خراب صورت بستی کو بس دیکھے جاتا ہے۔ شعر میں ایک مسلسل بے کسی اور بے بسی کی کیفیت نمایاں ہے۔ بقول میر:

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے
پچھتاؤ گے سنو ہو یہ بستی اجاڑ کے

شعر:5

یوں خاک میں ملا یاں اس بن کہ کچھ نہ پوچھو
اس ظلم دیدہ دل کا ہم اضطراب دیکھا

ظلم دیدہ دل: جس پر ظلم کیا جائے
اضطراب: بے چینی

شاعر محبوب کی ستم گری کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہتا ہے کہ محبوب نے عاشق کو ہجر کا ایسا تحفہ دیا ہے جس کی بدولت عاشق کا دل خاک ہو گیا ہے۔ محبوب کے رویے نے عاشق کے دل کو بے چین و بے کل کر ڈالا ہے اور شاعر اس ظلم برداشت کرنے والے دل کا عینی شاہد ہے اس لیے وہ اس کی تکلیف کو بخوبی سمجھ سکتا ہے۔۔اور کیسے نہ سمجھے کہ یہ دل خود شاعر کا ہی تو ہے۔محبوب کے بغیر شاعر کا وجود ختم ہو چکا ہے اور اس میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں رہی بلکہ وہ ایک زندہ لاش سے مماثل ہے۔اس کے پورے وجود میں سب سے زیادہ رنج اس کے دل نے اٹھایا ہے اور اس رنج نے دل کو اس قدر شکستہ کر دیا ہے کہ اسے دیکھنے والا بے اختیار آہ بھرنے لگتا ہے۔

شعر:6

لیتے ہی نام اس کا سوتے سے چونک اٹھے
ہے خیر میر صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا

شاعر محوِ نوم ہے کہ اس کے محبوب کا ذکر چلتا ہے۔محبوب کا نام سنتے ہی شاعر چونک کر نیند سے اٹھ بیٹھتا ہے۔شاعر کے چونکنے سے یہ امکان ظاہر ہوتا ہے کہ محبوب کے نام سے یا تو اس کی کوئی ایسی تلخ یاد وابستہ ہے کہ وہ محبوب کا نام سن کر نیند کے عالم میں بھی چونک جاتا ہے اور حواس باختہ ہو جاتا ہے۔یا پھر اپنے علاوہ کسی اور کی زباں سے محبوب کا نام سن کر اس لیے بھی چونک اٹھتا ہے کہ کہیں اس کے محبوب کے بارے کوئی بدگوئی ہی نہ کر دے۔ایک امکان یہ بھی ہے کہ محبوب شاعر کے خیال میں اس قدر بس چکا ہے کہ نیند میں بھی محبوب کا نام سنتے ہی شاعر کے حواس چوکنے ہو جاتے ہیں اور یہ حالت محبوب سے از حد تعلق کی مظہر ہے۔گویا

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ

والی کیفیات یہاں بھی جلوہ انگیز ہیں۔شاعر کے مخاطب کا انداز اور "ہے خیر میر صاحب" کے الفاظ اس بات کے غماز ہیں کہ شاعر جب محبوب کا نام سن کر نیند سے چونکتا ہے تو اس کی حواس باختگی بے اختیار اس کے مخاطب کو اس کی خیرو

عافیت دریافت کرنے پراکساتی ہے۔ گویا اغلب امکان یہی ہے کہ شاعر کی محبوب کے نام سے وابستہ یادیں لطیف نہیں ورنہ وہ یوں حواس باختہ نہ ہوتا۔

3.4۔ غزل:4

جیتے جی کوچہ دلدار سے جایا نہ گیا
اس کی دیوار کا سر سے مرے سایہ نہ گیا
وہ تو کل دیر تلک دیکھتا ایدھر کو رہا
ہم سے ہی حال تباہ اپنا دکھایا نہ گیا
گرم رو راہ فنا کا نہیں ہوسکتا پتنگ
اس سے تو شمع نمط سر بھی کٹایا نہ گیا
مہ نے آ سامنے شب یاد دلایا تھا اسے
پھر وہ تا صبح مرے جی سے بھلایا نہ گیا
خاک تک کوچہ دلدار کی چھانی ہم نے
جستجو کی پہ دل گم شدہ پایا نہ گیا
زیر شمشیر ستم میر تڑپنا کیسا
سر بھی تسلیم محبت میں ہلایا نہ گیا

شعر:1

جیتے جی کوچہ دلدار سے جایا نہ گیا
اس کی دیوار کا سر سے مرے سایہ نہ گیا

شاعر کہتا ہے کہ زندگی میں تو اس کے لیے یہ ممکن نہ ہوا کہ وہ کوئے یار کو خیر باد کہہ دے۔ دلداری کا یہ عالم تھا کہ شاعر اگر چہ کوچۂ محبوب کے اندر نہ ٹھہر سکتا تھا لیکن اس نے تمام عمر اس کوچے کی دیوار سے لگ کر گزار دی۔ تمام عمر اسے کوئے یار کی دیوار کا سایہ ہی کافی رہا۔ اس نے اسی سایے سے قربت کا وہ نشہ کشید کر لیا جو اندرونِ خانہ رہنے والوں کے حصے میں تھا۔ اس کے لیے محبوب کی بس نسبت ہی کافی تھی اور اس نے اسی نسبت کے سہارے زندگی گزار دی۔ بہ الفاظِ دیگر شاعر نے تمام عمر عشق کی راہ میں گزار دی لیکن دنیا کی کوئی طاقت اسے دریار سے جدا نہ کر سکی۔ اب موت ہی باقی ہے کہ جو عاشق کو کوچ دلدار سے جدا کر دے۔ شاعر نے عشق میں ثابت قدمی کا عمدہ مرقع پیش کیا ہے۔

شعر:2

وہ تو کل دیر تلک دیکھتا ایدھر کو رہا
ہم سے ہی حال تباہ اپنا دکھایا نہ گیا

شاعر کہتا ہے کہ کل مزاجِ یار میں پرسان حالی کا عنصر نمایاں تھا اسی لیے وہ دیر تک شاعر سے نگاہوں ہی نگاہوں میں حال پوچھتا رہا۔ ادھر شاعر بھی اس نگاہ کا سوال بھانپ گیا مگر ہائے بےبسی کہ شاعر سے جواب بن نہ پایا۔ شاعر کی تباہ حالی نے اسے اس قدر رختہ کر دیا تھا کہ اس سے اپنا ٹکڑے ٹکڑے ہوتا وجود متشکل کرنے میں دشواری ہو رہی تھی اور اسی لیے وہ اپنا کچھ حال بیان ہی نہ کر سکا۔ شاعر کی بھی کیا قسمت ہے کہ خدا خدا کر کے محبوب نے حال پوچھا اور عالم یہ ہے کہ شاعر اپنی شکستگی بیان کرنے سے ہی قاصر ہے۔ محبوب اول تو بے اعتنائی برتتا ہے، توجہ کرے تو عاشق کو اپنی داستان کہنے کا یارا ہی نہیں ہوتا اور اگر وہ بہت ہی ہمت کرے تو عین موقع پر زبان ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔ یوں بدحالی اور حرماں نصیبی عاشق کا مقدر رہتی ہے۔

شعر:3

گرم رو راہ فنا کا نہیں ہوسکتا پتنگ
اس سے تو شمع نمط سر بھی کٹایا نہ گیا

راہِ فنا: عدم کی راہ

نمط: کی طرح، مانند

پروانے کی فطرت میں ہے کہ وہ شمع کے قریب آتا ہے اور اس قربت کی پاداش میں جل کر مر جاتا ہے۔ پروانے کی موت لمحہ بھر کی کہانی ہے۔ بس ایک لمحے میں ہی وہ قیدِ حیات سے آزاد ہو جاتا ہے، گھڑی بھر میں ہی اس کی مشکلاتِ زندگانی کا قصہ تمام ہو جاتا ہے اور اس کی موت کا ذمہ دار بھی شمع کو ہی ٹھہرایا جاتا ہے۔ دوسری جانب شمع تو خود سراپا غم ہے۔ اسے قسمت سے گریہ مسلسل کا تحفہ ملا ہے اور شب بھر جلتے رہنا اس کا مقدر ہے۔ جب وہ قطرہ قطرہ پگھلتی ہے تو اس کی ذات بھی قطرہ قطرہ عدم میں تحلیل ہوتی جاتی ہے۔ فنا کی راہ میں شمع کا مقدر جل جل کر مرنا ہے اور یہ آگ اس کی پوری ذات کو اپنی لپیٹ میں لیے رکھتی ہے۔ شمع کی بتی پل پل شمع کا سر کاٹتی ہے اور ہر پل عدم زندگی کا احساس اس کے آنسوؤں کو مزید رواں کر دیتا ہے۔ ایک وقت آتا ہے کہ شمع کی لو جل جل کر اس کی مکمل طور پر ختم ڈالتی ہے۔ شمع کی زندگی تمام غم ہے جبکہ پروانے کی زندگی کا فقط لمحِ موت ہی غم سے عبارت ہے۔ شمع تمام عمر سر کٹاتی رہتی ہے اور اپنا وجود مٹاتی رہتی ہے، پروانہ مقدور بھر اڑان بھر، سانس لے کر ہی مرتا ہے۔ راہِ فنا میں پروانے کی روداد شمع کی سی پُر درد نہیں کیونکہ پروانے کے پاس شمع کی مانند سر کٹانے کا حوصلہ ہی نہیں ہے۔ یعنی کارگاہِ عشق میں حوصلہ اور ثابت قدمی ہی کامیابی کی شرطِ اول ہے۔ تنک حوصلوں کو اس راہ میں نہیں آنا چاہیے کیونکہ عشق کے آزار برداشت کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ بقول

شاعر:

سر شمع ساں کٹائیے پر دم نہ ماریے
منزل ہزار سخت ہو ہمت نہ ہاریے

شعر:4

مہ نے آ سامنے شب یاد دلایا تھا اسے
پھر وہ تا صبح مرے جی سے بھلایا نہ گیا

مہ: چاند

شاعر کہتا ہے کہ وہ تو محبوب کو بھلا چکا تھا اور اس کی یاد سے اپنا پہلو بچائے رکھتا تھا۔لیکن گزشتہ رات جب اس نے چاند کو دیکھا تو اسے چاند میں روئے یار کا عکس نظر آنے لگا۔اداس، تنہا اور اکیلے چاند نے شاعر کے دل میں محبوب کی سوئی یاد کو اس ادا سے جگا دیا کہ پھر وہ رات بھر محبوب کو یاد کرتا رہا یہاں تک کہ صبح ہو گئی ۔صبح کی روشنی میں چاند کا چہرہ تحلیل ہوا تب کہیں شاعر نے بھی اس چہرے کا تصور اپنے خان خیال سے نکالنے کی کوشش کی۔گویا محبوب کو جس قدر بھی بھلانے کی کوشش کی جائے وہ کسی نہ کسی طرح زندگی کے ہر موڑ پر اپنا جلوہ دکھا ہی دیتا ہے اور حسن و عشق کے ان معاملات سے مفر ممکن نہیں۔ جگر مراد آبادی کے الفاظ میں:

اس عشق کے ہاتھوں سے ہرگز نہ مفر دیکھا
اتنی ہی بڑھی حسرت جتنا ہی ادھر دیکھا

شعر:5

خاک تک کوچہ دلدار کی چھانی ہم نے
جستجو کی پہ دل گم شدہ پایا نہ گیا

پہ: پر، لیکن

شاعر کا دل کہیں کھو چکا ہے اور اغلب یہی ہے کہ یہ کوچہ دلدار میں کہیں گم ہوا ہے۔شاعر بھی اسی امکان کے پیشِ نظر کوئے یار کی خاک چھانتا ہے لیکن افسوس کہ اسے محبوب کے ہاں اپنا دل نہیں ملتا۔یعنی محبوب نے اس سے دل لے تو لیا لیکن پھر اس دل کی پروا نہ کی اور اسے سنبھال کر نہ رکھا۔اب جو شاعر کو ہوش آیا تو وہ بے چارہ اپنا گمشدہ دل لینے محبوب کے ہاں جا پہنچا لیکن افسوس کہ اس کی اس خاک نوردی کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔

شعر:6

زیر شمشیر ستم میر تڑپنا کیسا
سر بھی تسلیم محبت میں ہلایا نہ گیا

شمشیر:تلوار

شاعر کہتا ہے کہ ستم کی تلوار تلے تڑپنے کی تو کوئی صورت ہی نہیں بنتی کیونکہ یہ تلوار محبوب نے اٹھا رکھی ہے اور کس کی یہ مجال کہ محبوب کے حکم سے سرتابی کرے۔ شاعر کے ہاں محبوب کی تابعداری کا یہ عالم ہے کہ وہ تسلیمِ محبت میں بھی سر ہلانے کی جسارت نہیں کرتا، یہ تو پھر شمشیر زنی کا معاملہ ہے۔ یعنی جو لوگ محبوب کے مظالم پر شکوہ کناں ہوتے ہیں اور تڑپنے کا اظہار کرتے ہیں وہ ابھی کارِ عشق میں ناپختہ ہیں اور یہی ناپختگی ان کے تڑپنے کی دلیل ہے۔ سچا عاشق اس کارگاہ میں تڑپنا تو در کنار اطاعت میں سر کو جنبش تک نہیں دیتا بلکہ چپ چاپ محبوب کا تختہ مشق بن جاتا ہے اور شاعر چونکہ محبوب کی طبیعت سے واقف ہے اس لیے ایسا کرنے میں اسے کوئی تامل نہیں ہے۔ میر کا یہ شعر عاشق کی حد درجہ برداشت اور ثابت قدمی کا غماز ہے۔

3.5۔ غزل:5

دل کے تئیں آتش ہجراں سے بچایا نہ گیا
گھر جلا سامنے پر ہم سے بجھایا نہ گیا
دل میں رہ دل میں کہ معمار قضا سے اب تک
ایسا مطبوع مکاں کوئی بنایا نہ گیا
کیا تنک حوصلہ تھے دیدہ و دل اپنے آہ
ایک دم راز محبت کا چھپایا نہ گیا
دل جو دیدار کا قاتل کے بہت بھوکا تھا
اس ستم کشتہ سے اک زخم بھی کھایا نہ گیا
میں تو تھا صید زبوں صید گہ عشق کے بیچ
آپ کو خاک میں بھی خوب ملایا نہ گیا
شہر دل آہ عجب جائے تھی پر اس کے گئے
ایسا اجڑا کہ کسی طرح بسایا نہ گیا

شعر:1

دل کے تئیں آتش ہجراں سے بچایا نہ گیا
گھر جلا سامنے پر ہم سے بجھایا نہ گیا

آتشِ ہجراں: ہجر کی آگ

شاعر کہتا ہے کہ اگر چہ اس نے اپنے دل کو ہجر کے صدمات سے بچانے کی بہت کوشش کی لیکن افسوس کہ اس کی یہ کوشش اکارت گئی۔ ہجر کی آگ نے اس کے دل کو جلا کر ختم کر دیا۔ اسی دل سے شاعر کی زندگی کی ڈور بندھی تھی، دل گیا تو یوں لگا کہ زندگی ختم ہوگئی۔ گویا شاعر کے سامنے اس کے گھر کو آگ کھا گئی لیکن شاعر میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ اپنا گھر، اپنی زندگی، اپنا دل بچالیتا۔ ہجر کے صدمے نے شاعر کو ادھ موا کر دیا ہے۔ وہ زندہ ہو کر بھی اس قابل نہیں ہے کہ اپنا دفاع ہی کر سکے۔ اسی لیے تو اس نے چپ چاپ اپنا آشیاں آگ کے حوالے کر دیا۔ ہجر وفراق کی آگ سے یہ دل صرف ایک صورت بچ سکتا تھا کہ اگر محبوب اپنے التفات کی بارش کرتا تو یہ آگ فوراً بجھ جاتی لیکن محبوب کو یہ گوارا نہ ہوا اور اس کا دل راکھ ہو گیا۔

شعر:2

دل میں رہ دل میں کہ معمار قضا سے اب تک
ایسا مطبوع مکاں کوئی بنایا نہ گیا

معمار قضا: بقا وقضا کا فیصلہ کرنے والا، مراد خدا تعالیٰ

مطبوع: مرغوب، پسندیدہ، طبیعت کے موافق

شاعر کہتا ہے کہ انسان کے ٹھکانے کی اصل جگہ ایک انسان کا دل ہی ہے، جب وہ کسی دل میں گھر کر لے تو اسے دوام مل جاتا ہے۔ دل ایک ایسا مکاں ہے کہ آج تک فطرت نے ایسا کوئی اور ٹھکانہ تخلیق نہیں کیا۔ معمار قضا کی قدرت میں ہے کہ وہ جس شے کو جیسے اور جس دورانیے تک کے لیے چاہے ویسے تخلیق کرے اور اس مکاں یعنی دل کی تعمیر میں قدرت کی صناعی کھل کے سامنے آتی ہے۔ قدرت نے دل کو مرغوب ومحبوب ٹھکانہ بنایا ہے۔ دنیا کی کوئی عمارت دل ایسی خوبصورت نہیں سو جو دل میں آن بسا، دنیا اس کے خیال سے جاتی رہتی ہے۔ بلاشبہ دل فطرت کی خوبصورت ترین تخلیق ہے کہ جس میں محبت کے دیپ روشن رہتے ہیں۔ اس شعر میں شاعر کا خطاب بالعموم انسان سے اور بالخصوص محبوب سے ہے۔

شعر:3

کیا تنک حوصلہ تھے دیدہ و دل اپنے آہ
ایک دم راز محبت کا چھپایا نہ گیا

تنک حوصلہ: کم حوصلہ، کم ہمت

شاعر کہتا ہے کہ اس کے دیدہ و دل کے حوصلے تو بہت پست نکلے جو رازِ محبت کو آشکار کر ڈالا۔ شاعر تو اس محبت کو سینت سینت کر رکھنے کا ارادہ کیے ہوئے تھا لیکن اس کے دل اور اس کی آنکھوں نے اس کا ساتھ نہ دیا اور نظروں کی چوری تو صاف پکڑ لی جاتی ہے۔ اِدھر والہانہ نظریں محبوب چہرے کا طواف کرتی ہیں اور اُدھر بات نکل جاتی ہے سو نظر سے تو گلہ ہی کیا کہ وہ تو راز کو راز رکھ ہی نہیں سکتی۔ شاعر دیدہ و دل کی واردات پہ شرمندہ ہے کہ ایسی بھی کیا بے تابی کہ دو گھڑی بھی راز کو راز نہ رکھا جا سکے۔ دوسرا قرینہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آنکھ چھلک اٹھی اور دل بے قرار ہو کر آہ کر بیٹھا اور یوں معاملاتِ عشق افشا ہو گئے۔ اگر دیدہ و دل یوں کم حوصلہ نہ ہوتے تو یہ راز یوں طشت از بام نہ ہوتا۔

شعر:4

دل جو دیدار کا قاتل کے بہت بھوکا تھا
اس ستم کشتہ سے اک زخم بھی کھایا نہ گیا

ستم کشتہ: ستم کھانے والا، برداشت کرنے والا

عاشق کے دل کو دیدارِ یار کی بہت تمنا تھی۔ محبوب اگرچہ ستم گر ہی سہی، عاشق کو اس کے دیدار کی طلب بہر حال تھی۔ لیکن یہ کیا کہ جب محبوب اداہائے قاتلانہ کے ساتھ لبِ بام آیا تو عاشق اس کا روپ سہار ہی نہ سکا۔ عاشق میں تو ذرا حوصلہ نہیں کہ وہ محبوب کی ایک ادا کو ہی سہہ لے۔ کہاں تو وہ زندگی بھر محبوب کے دیے ستم برداشت کرتا رہا ہے اور کہاں اب یہ عالم آن پہنچا ہے کہ ایک ادائے قاتلانہ کو بھی برداشت کرنا مشکل ہو چلا ہے۔ عاشق تو خود جلوے کا متمنی تھا لیکن اس کی پست حوصلگی کا کیا کیجیے کہ اب اس میں زخم خوردگی کا حوصلہ باقی نہیں رہا۔ میر نے عاشق کی بے طاقتی و ناتوانی کا عمدہ مرقع کھینچا ہے۔ غالب کے الفاظ میں یہی مضمون یوں ملتا ہے:

مر گیا صدمہ یک جنبشِ لب سے غالب
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

شعر:5

میں تو تھا صید زبوں صید گہ عشق کے بیچ
آپ کو خاک میں بھی خوب ملایا نہ گیا

صید زبوں: بدحال شکار/قیدی

صید گہ: قید خانہ

شاعر عشق کے تیر سے ایسا گھائل ہوا کہ نیم جاں ہو گیا، نہ زندگی رہی نہ ہی موت ملی۔ اس کی کیفیت ایک قریب المرگ پرندے کی سی ہو گئی اور وہ زندگی و موت کے دوراہے پہ آ کھڑا ہوا۔ ایسے میں شکاری یعنی محبوب کی مہربانی ہوتی جو وہ اسے ایسی زندگی سے آزاد ہی کر دیتا لیکن بھلا ہو اس کا کہ اس نے اسے جان بخشی اور عشق کے قید خانے میں لا چھوڑا۔

شاعر کہتا ہے کہ اس عالمِ اسیری میں وہ اس قدر ضعف میں رہا کہ وہ خود کو مٹی تک میں ملانے سے قاصر رہا۔ وہ جو عشق کی راہ میں خود خاک ہونا چاہتا تھا، پہلی ہی منزل پر ہار گیا اور عشق کے جال میں ایسا پھنسا کہ اپنے ارادوں سمیت تاحیات قید ہو گیا۔ سو اس صید گاہ میں صیاد کی مہربانی سے نوبت یہاں تک آن پہنچی کہ نہ ہی زندگی کا کامل احساس ہے اور نہ ہی موت کا۔ غالب نے اس طرح کا مضمون اپنے ایک شعر میں نظم کیا ہے:

تو مجھے بھول گیا ہو تو پتا بتلا دوں
کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

شعر:6

شہرِ دل آہ عجب جائے تھی پر اس کے گئے
ایسا اجڑا کہ کسی طرح بسایا نہ گیا

شاعر کا دل کسی پرشکوہ شہر کی طرح آباد تھا اور اس میں ہر طرف چہل پہل رہتی تھی۔ یہ شہرِ دل بھی کیا خوب تھا کہ جو بھی اس دل میں آن ٹھہرتا، مہر و الفت ک بارش اس پر خوب برستی۔ لیکن یہ تب کی بات ہے کہ جب محبوب بڑے ناز اور تمکنت کے ساتھ اس بستی میں حکمرانی کرتا تھا اور دیگر تمام محبتیں اس کے زیرِ سایہ پنپتی تھیں۔ جب سے محبوب نے یہ علاقہ چھوڑا تب سے یہ ایسا اجڑا کہ پھر بس ہی نہ سکا۔ گویا شہرِ دل کی آبادی کا کل تعلق محبوب سے ہی تھا، اگر وہ ہی نہیں تو اس کے بغیر اس دل کی حیثیت ایک اجاڑ بستی سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ شاعر نے ہزار حیلے کیے لیکن وہ محبوب کے بغیر شہرِ دل کو آباد کرنے میں ناکام ہی رہا ہے۔

4۔ خود آزمائی

1۔ میر تقی میر کے عہد کے آشوب کے تناظر میں ان کے کلام کا جائزہ لیجیے اور مثالیں بھی پیش کیجیے۔
2۔ میر کی شاعری کی خصوصیات پر ایک مفصل مضمون قلم بند کیجیے۔
3۔ میر کے ہاں غم کی صورت ذاتی ہے یا کائناتی؟ دلائل کے ساتھ بحث کیجیے۔
4۔ میر کے تصورِ عشق میں ادب اور خود سپردگی بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ اظہار خیال فرمائیے۔
5۔ ایک غزل گو کی حیثیت سے میر کے مقام کا تعین کیجیے۔

5۔ مجوزہ کتب برائے مطالعہ:

1۔ میر تقی میر، کلیات میر (جلد اول)، مرتبہ کلب علی خان فائق، مجلس ترقی ادب، لاہور، 1986ء
2۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو (جلد دوم)، مجلس ترقی ادب، لاہور، 1990ء
3۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، محمد تقی میر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 1990ء
4۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، نقد میر، مکتبہ خیابان ادب، لاہور، 1968ء
5۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، دلی کا دبستان شاعری، انجمن ترقی اردو، دلی، 1949ء
6۔ رسالہ نقوش، میر تقی میر نمبر، ادارہ فروغ اردو، لاہور، 1980ء
7۔ رسالہ غالب نامہ، میر تقی میر نمبر، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، 2000ء

یونٹ نمبر 4

غزلیاتِ آتش

تحریر: ڈاکٹر محمود الرحمٰن
نظر ثانی و اضافہ: پروفیسر ڈاکٹر محمد کامران

فہرست

یونٹ کا تعارف

زیرِ نظر یونٹ میں آپ آتش کی شخصیت اور شاعری کا مطالعہ کریں گے اور ان کی منتخب غزلوں کا جائزہ لیں گے۔ یہاں یہ بتا دیا جائے تو مناسب ہوگا کہ خواجہ آتش اردو زبان کے کامل استاد اور بلند مرتبت شاعر تھے۔ ان کا کلام تصنع اور تکلف سے پاک اور سوقیانہ خیالات سے مبرا ہے۔ ان کے اشعار میں عشق کی گرمی اور جذبات کی حرارت پائی جاتی ہے۔ تاثیر اور دردمندی کے اعتبار سے آتش کی غزل کے بہت سے اشعار میر کے ہم پلہ ہیں۔ اشعار میں روانی اور موسیقی حد درجے تک پائی جاتی ہے۔ بندش کی چستی الفاظ کی حلاوت اور مضمون کی بلندی کی وجہ سے آتش کو اپنے ہمعصر شاعروں پر فوقیت حاصل ہے۔

یونٹ کے مقاصد

اس یونٹ کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ کو اس قابل ہو جانا چاہیے کہ:

۱۔ ایک غزل گو کی حیثیت سے آتش کی عظمت اور اہمیت کا تعین کر سکیں۔

۲۔ آتش کے رنگ تغزل کو بیان کر سکیں۔

۳۔ آتش کے کلام کے مقبول عام ہونے کی وجوہات بیان کر سکیں۔

۴۔ اردو کے غزل گو شعرا میں خواجہ آتش کا مرتبہ طے کر سکیں۔

۵۔ آتش کی شامل نصاب غزلوں کا بغور مطالعہ کر کے ان کی مناسب تشریح کر سکیں۔

1۔ خواجہ حیدر علی آتش

(1767ء۔1847ء)

1.1 سوانح

خواجہ حیدر علی نام، آتش تخلص۔ ان کے والد خواجہ علی بخش دلی کے رہنے والے تھے۔ امتداد زمانہ کے باعث وہاں کی سکونت ترک کر کے فیض آباد گئے۔ یہیں آتش 1767ء میں پیدا ہوئے۔ اگر چہ انھیں درس و تدریس کا باقاعدہ موقع نہیں ملا، لیکن ذوق سلیم اور اودھ کے علمی و ادبی ماحول نے رہبری کی۔ پھر اس دور کے امیروں اور نوابوں کی صحبت میں رہ کر بہت کچھ اکتساب علم کیا۔ سن بلوغت کو پہنچنے کے بعد خواجہ آتش فیض آباد کے رئیس مرزا محمد تقی خاں کے دربار میں ملازم ہوئے۔ مرزا صاحب کے لکھنؤ منتقل ہونے پر یہ بھی وہیں چلے گئے۔ یہاں آ کر مصحفی کے شاگرد ہوئے۔ اس شاگردی نے انھیں ناسخ لکھنوی کے اثرات سے بچایا۔

تصوف آتش کے خاندان کی اہم روایت تھی وہ خود بھی فقیر منش اور درویش سیرت انسان تھے۔ بڑے قناعت پسند تھے۔ اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ غریبوں پر خرچ کر دیتے۔ لباس میں قلندرانہ شان تھی۔ آخر عمر میں آنکھ کی بینائی جاتی رہی تھی۔ انھوں نے 1847ء میں وفات پائی۔ انھیں اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر گوئی کا شوق تھا۔ دو ضخیم دیوان یادگار چھوڑے۔ ان کے شاگردوں میں محمد خاں رند، وزیر علی صبا اور پنڈت دیا شنکر نسیم نے بہت شہرت پائی۔ شعرائے متاخرین کے دور اوّل میں آتش لکھنوی اپنی جگہ مستقل ایک ادارے کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کا رنگ سخن دیگر شعرائے اردو سے مختلف تھا۔

1.2 محاسن کلام

خواجہ حیدر علی آتش، ناسخ لکھنوئ کے ہم عصر اور اردو کے بہترین غزل گو شعرا میں سے ہیں۔ ان کا کلام ناسخ کی طرح خارجی رنگ میں ڈوبا ہوا نہیں، بلکہ ان کی غزلوں میں جذبات کی گرمی، انسانی ماحول اور تصوف کے بہترین عناصر ملتے ہیں۔ ان کے کلام میں زبان کی صفائی کے ساتھ ساتھ دل و دماغ کو چونکا دینے والی باتیں کثرت سے ملتی ہیں۔ سوز و گداز کے لحاظ سے بھی آتش لکھنوئ کا رنگ تغزل ناسخ لکھنوی سے بدرجہا بہتر ہے۔

خواجہ آتش کا کلام تصنع اور تکلف سے پاک اور ابتذال اور سوقیانہ خیالات کی پستی سے مبرا ہے۔ ان کے تغزل میں عشق کی گرمی اور جذبات کی حرارت پائی جاتی ہے۔ گویا ان کا تخلص اسم بامسمیٰ ہے۔ اشعار میں بے حد روانی اور موسیقیت ہے۔ الفاظ کے حسن انتخاب اور محاورات کے برمحل استعمال سے ان کے کلام میں دلکشی و دلآویزی پیدا ہو جاتی ہے۔ تاثیر اور دردمندی کے اعتبار سے ان کے اشعار میر جیسے شاعر کے ہم پلہ قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ خواجہ آتش جذبات کو موثر اور دلکش الفاظ و انداز میں ادا کرنے پر عبور رکھتے تھے۔ مزید برآں، سادگی زبان اور رفعت تخیل ان کے کلام کی خاص خوبیاں ہیں۔

1.3 کلام آتش اور رجائیت

لکھنوی شاعری میں بالعموم داخلیت کی بجائے خارجیت پر زور دیا جاتا رہا ہے اور آمد کی جگہ آورد نے لی اور قافیہ پیمائی بھی ضروریات شعری میں شمار ہونے لگی۔ لیکن آتش نے قلندری اور عوام دوستی کا مظاہرہ کیا۔ انھوں نے زبان کی عوامیت کے ساتھ ساتھ جذبات نگاری پر خاص توجہ کی۔ ان کی شاعری نے مرصع سازی کے وہ نمونے پیش کیے کہ آج بھی لکھنویت کی خصوصیت بنے ہوئے ہیں۔

خواجہ آتش کی غزلیں عموماً صاف اور شستہ ہوتی ہیں۔ اشعار میں روانی پائی جاتی ہے۔ بندشوں میں چستی اور مضامین میں شوخی کے ساتھ رنگینی و رعنائی نمایاں ہے۔ جوش و خروش اور سرمستی کا عنصر بھی ملتا ہے۔ خلیل الرحمان اعظمی نے مقدمہ کلام آتش میں آتش کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے بڑے پتے کی بات کی ہے۔

> ''آتش کے کلام میں غالب حصہ رجائیت اور زندگی کی قوت سے لبریز ہے۔ زندگی اور انسان کی عظمت کا احساس ہر ہر قدم پر ہوتا ہے۔ عام شعرا کی طرح مجبوری و بے چارگی، گھٹن اور کڑھن کا کہیں بھی نشان نہیں ملتا۔ یہاں تک کہ جہاں شاعر نے زندگی کے گہرے اور حقیقی غم کو اپنا موضوع بنایا ہے وہاں بھی اپنی شخصیت کے کس بل دکھانے سے باز نہیں آتا۔ وہ غم میں بھی کوئی نہ کوئی متحرک پہلو تلاش کر لیتا ہے اور مجموعی طور پر ہم پر یہ تاثر ہوتا ہے کہ یہ غم انسان کے لیے اس کی عظمت و قوت کا حامل ہے۔''
>
> (مقدمہ کلام آتش، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ، ۱۹۵۹ء، ص ۸۱)

یہ بات قابل غور ہے کہ لکھنوی شاعری کے مروجہ رنگ کو آتش نے آنکھ بند کر کے قبول نہیں کیا ہے۔ ان کے کلام میں خارجی مضامین اور متعلقات حسن کا ذکر کیا بھی ہے تو نہایت میانہ روی کے ساتھ۔ وہ اس معاملے میں حد سے تجاوز نہیں کرتے۔ البتہ جذبات نگاری میں وہ ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ جہاں اس نوع کا رنگ عموماً لکھنوی شعرا کے یہاں مفقود ہے، آتش کے یہاں اس کی بھرمار ہے۔ ان کے یہاں جذبہ بھی گرمی بھی ہے اور گداز بھی۔

آتش کے کلام کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ ان کے یہاں پر امیدی کے عناصر بھی ہیں اور رجائی انداز کی فراوانی بھی۔ یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ اردو غزل گوئی میں آتش لکھنوی پہلے شاعر ہیں جن کے یہاں زندگی کے متعلق اثباتی نقطہ نظر پایا جاتا ہے۔ دیگر غزل گو شعرا کی طرح ان کے کلام میں یاس و نا امیدی، لذت، ہوس، قنوطیت پسندی کے برعکس حرکت و عمل کی دنیا نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری میں نبرد آزمائی کا احساس ہویدا ہے اور زندگی سے بھرپور انداز میں حظ اٹھانے کا جذبہ کارفرما ہے۔ صحت مند نشاط و سرشاری کی کیفیت متحرک نظر آتی ہے۔

آتش کو شاعرانہ مرتبہ اعلیٰ غزل گوئی کی بدولت ہی انھیں حاصل ہوا تھا۔ انھوں نے غزل کو ایک نیا مزاج اور ایک نیا آہنگ عطا کیا تھا۔ ان کا سارا کلام دیکھا جائے آپ کو ہر جگہ للکار، معرکہ آزائی، جاں سپاری، ترنگ اور دھمک جیسی

خصوصیات ملتی ہیں۔ یہ وہ عناصر ہیں جو انھیں دیگر شعرائے اردو اور خصوصاً لکھنوی شعرا کے مخصوص اور نپے تلے لہجے سے یکسر منفرد کر دیتے ہیں۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ آتش اپنے ان ہم عصر شعرا سے بے حد مختلف ہیں جو موضوع اور جذبے سے زیادہ انداز بیان کی سجاوٹ، لفظی مناسبت اور عروضی نزاکت کی طرف زیادہ توجہ دیتے ہیں۔! ان کے یہاں لکھنوی تغزل کی نسائیت کارفرما نہیں اور نہ ہی اودھ کی نشاط انگیزی کا غلبہ ہے۔ وہ اپنے دور کے اوباشانہ طرز سخن سے بھی یکسر محفوظ دکھائی دیتے ہیں۔ بادی النظر میں ان کی غزل گوئی زبان کے چٹخارے کا ذریعہ نہیں بلکہ سلگتے جذبات اور حقیقی واردات کی آئینہ دار ہے۔ ان کے اشعار کے پس پردہ ایک جان دار آواز ابھرتی ہے جو ہماری اپنی ہی زبان معلوم ہوتی ہے۔

1.4 لکھنوی ماحول اور مردانہ لہجہ

لکھنوی ماحول میں رہنے، پلنے اور شاعری کرنے کے باوجود ان کا لب ولہجہ مردانگی کے لمس سے معمور ہے۔ یہ وہ لمس ہے جو زندگی کی بھرپور توانائی کا عکاس اور زندہ رہنے کی امنگ کا مظہر ہے۔ غرض، آتش لکھنوی کا مخصوص مزاج، ان کی ولولہ انگیز سوچ، زندہ رہنے کا جذبہ اور زندگی کرنے کا حوصلہ ان کی غزل گوئی کی نمایاں خصوصیت ہے۔ اردو غزل گوئی کی مروجہ ماتمی فضا کے مقابلے میں آتش لکھنوی کی یہ آواز زندگی کو حوصلہ بخشتی ہے۔ ذرا مندرجہ ذیل اشعار کے زندگی آموز اور زندگی آمیز تیور ملاحظہ فرمائیے:

اللہ رے پھڑکنا اسیران تازہ کا
صیاد خیر مانگتا ہے اپنے دام کی

وحشی تھے بوئے گل کی طرح سے جہاں میں ہم
نکلے تو پھر کے آئے نہ اپنے مکاں میں ہم

نہ پوچھ حال مرا چوب خشک صحرا ہوں
لگا کے آگ جسے کارواں روانہ ہوا

اڑتا ہے شوق راحت مزل سے اسپ عمر
مہمیز کس کو کہتے ہیں اور تازیانہ کیا
سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے
تھکیں جو پاؤں تو چل سر کے بل نہ ٹھہر آتش
گل مراد ہے منزل میں خار راہ میں ہے

چھوڑ کر ہم نے امیری کی فقیری اختیار
بوریے پہ بیٹھے ہیں قالیں کو ٹھوکر مار کر

یہ وہ اشعار ہیں جنھیں پڑھ کر ہر زمانے میں انسان کی روح میں بالیدگی آتی رہے گی اور ہم بلاخوف تردید انھیں اپنا ادبی وتہذیبی سرمایہ قرار دیتے رہیں گے۔ یہ خصوصیات آتش کے کلام میں یوں نمایاں ہیں کہ ان کی یہاں موضوع فن دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہے اور یہی شاعرانہ کلام ہیں۔ آتش کے کلام کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ غالب جیسے قادرالکلام غزل گو شاعر نے اپنے ایک خط میں ناسخ پر آتش کو فوقیت دی تھی اور یہ لکھا تھا کہ ان کا کلام بہت موثر ہے۔

مولانا عبدالسلام ندوی نے ''شعرالہند'' میں آتش کے کلام کے متعلق بڑی جچی تلی رائے دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''اردو میں رندانہ مضامین میں خواجہ حافظ کے جوش اور ان کی سرمستی کا اظہار صرف خواجہ آتش کی زبان سے ادا ہوا ہے۔ خارجی مضامین ان کے کلام میں بھی ہیں لیکن جب وہ حلقہ ہائے گیسوئے نکل کر جذبات کی دنیا میں قدم رکھتے ہیں تو ان کی شاعری عشق ومحبت کے رموز واسرار کی آئینہ دار بن جاتی ہے۔''

(شعرالہند، حصہ اول، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۶۹ء ص ۲۱۸)

الغرض آتش لکھنوی ایک مضبوط اور توانا شخصیت کے مالک تھے۔ ناسخ کی طرح ان کی شاعری خارجی رنگ میں ڈوبی ہوئی نہیں، بلکہ ان کے تغزل میں جذبات دروں کی گرمی، انسانی زندگی کی جیتی جاگتی فضا اور سلوک معرفت کے بہترین بلند تر عناصر ملتے ہیں۔

1.5 دبستان لکھنو کی اصلاح

لکھنوی ہونے کے باوجود لکھنو کا شعری ماحول ان پر غالب نہ آسکا۔ آتش لکھنوی کے کلام میں رنگینی وشوخی کے ساتھ وہ درویشی اور سپاہیانہ انداز ہے جو ان کی زندگی میں تھا۔ وہ اپنے ہم عصر ناسخ کی طرح خیالی مضمون نہیں باندھتے۔ ان کے کلام میں ثقیل اور بوجھل الفاظ بھی نہیں ملتے۔

واضح رہے کہ لکھنو کے عام شعرا کو عشق کے سچے جذبات واحساسات سے کوئی خاطر نہ تھا۔ اس کے برعکس، آتش کی شاعری میں خلوص بھی ہے، صداقت بھی ہے اور بلند جذبات بھی ہیں ان کا تصور عشق بہت بلند ہے۔ وہ صحیح معنوں میں عشق کو زندگی کی ایک تعمیری قوت سمجھتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری میں زیست کے اہم اور بنیادی مسائل بھی نہایت شاعرانہ حسن وبلاغت کے ساتھ ملتے ہیں۔ وہ پڑھنے والے کو مسلسل حوصلہ اور جواں مردی کا پیغام دیتے ہیں:

ناگوارا کو جو کرتا ہے گوارا انسان
زہر پی کر مزہ شیر وشکر لیتا ہے

بعد کے دور میں دبستان لکھنو کی غزل گوئی میں جو اصلاح کی گئی، اس کے بانی آتش ہی ہیں کیونکہ وہ ناسخ کی زندگی میں ہی ان کے خارجی اثرات، محبوب کے جسم وزیوارت کے تذکرے اور صنائع بدائع کے خلاف ایک مستحکم دیوار بن چکے تھے۔ آتش اپنے جذبات کو صداقت کے ساتھ پیش کرنے کو مقصد شعر سمجھتے تھے۔ غرض، ان کے کلام صداقت آمیز نے صفی لکھنوی، عزیز لکھنوی، ثاقب لکھنوی اور اثر لکھنوی کی رہنمائی کی۔ ان شعرائے جدید نے نتیجتاً لکھنو سکول کے انداز غزل گو کو بدل ڈالا۔ یہ اردو شاعری پر صحیح معنوں میں آتش کا فیضان ہے اور انھی اوصاف کی بنا پر وہ، ہر خاص و عام میں مقبول بھی ہیں اور ان کے کلام نے قبول عام کی سند حاصل کی ہے۔

2۔ اہم نکات

1۔ آتش ایک مضبوط شخصیت کے مالک تھے۔

2۔ ناسخ کا انداز سخن اور لکھنو کا شعری ماحول ان پر غالب نہ آ سکا۔

3۔ آتش کے کلام میں رنگینی وشوخی کے ساتھ وہ درویشی اور سپاہیانہ انداز ہے جو ان کی زندگی میں تھا۔

4۔ وہ ناسخ کی طرح خیالی مضمون نہیں باندھتے۔

5۔ آتش کے کلام میں ثقیل اور بوجھل الفاظ بھی نہیں ملتے۔

6۔ آتش کی شاعری میں خلوص بھی ہے اور بلند جذبات بھی۔

7۔ ان کا تصور عشق بہت بلند ہے۔

8۔ ان کی شاعری میں زندگی کے گوناگوں مسائل شاعرانہ حسن کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔

9۔ ان کی غزلیات میں جذبات کی گرمی، انسانی ماحول اور تصوف کے اعلیٰ عناصر ملتے ہیں۔

3۔ تشریحات

3.1 غزل نمبر 1

سن تو ہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا
زیرزمین سے آتا ہے جو گل سو زربکف
قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا
طبل وعلم نہ پاس ہے اپنے نہ ملک ومال
ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا
آتی ہے کس طرح سے مری قبض روح کو
دیکھوں تو موت ڈھونڈ رہی ہے بہانہ کیا
یوں مدعی حسد سے نہ دے داد، تو نہ دے
آتش غزل یہ تو نے کہی عاشقانہ کیا

شعر نمبر 1

سن تو ہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

خلق خدا = اللہ کی مخلوق۔عوام الناس

غائبانہ = غیرموجودگی میں۔پیٹھ پیچھے

اس شعر میں شاعرمحبوب سے ہم کلام ہوکر یہ عرض کر رہا ہے کہ تو نے ظلم وستم کا جو وتیرہ اختیار کر رکھا ہے اور ایک عالم کو مایوس ونامراد کر دیا، اس کا چرچا ہر جگہ ہو رہا ہے۔اپنے ظالمانہ رویے اور سنگدلی کے نتیجے میں تو خلق خدا میں کسی نیک نامی کا نہیں، برائی اور بدخوئی کا پیکر تصور کیا جا رہا ہے۔لوگ تجھے نگاہ تحسین سے نہیں دیکھتے۔کاش تو مخلوق خدا کی یہ باتیں سنتا اور تجھے اپنی حیثیت کا اندازہ ہوتا۔بادی النظر میں آتش انسان کی نیک نامی یا بدنامی کا معیار خلق خدا کو قرار دیتے ہیں۔اگر ایک شخص نیک سیرت ہے اور اعلیٰ اخلاق کا حامل تو عوام الناس کی کسوٹی پر وہ تحسین کا موجب قرار پائے گا۔بصورت دیگر ذلت ورسوائی اس کا مقدر ہے۔

شعر نمبر 2

زیرِ زمین سے آتا ہے جو گل سو زربکف
قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا

زر= خالص سونا

بکف= ہتھیلی پر لیے ہوئے

قارون = ایک مالدار شخص کا نام جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وقت میں تھا اوراس پر خدا کا عذاب نازل ہوا تھا۔

اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ جو پھول زمین کے نیچے سے اگتا ہے وہ اس طرح سنہرہ رنگین اور خوب صورت دکھائی دیتا ہے جیسے وہ اپنے دامن میں سونے کے سینکڑوں ذرات لے کر بالائے زمین آیا ہو۔اس کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے قارون نامی دولت مند شخص نے راستے میں خزانہ لٹایا ہو اور پھول اس سے مالا مال ہو کر آیا ہو۔آتش نے پھول کی رنگینی اور رعنائی کو ظاہر کرنے کے لیے جو تمثیل بیان کی ہے وہ خیالی نہیں حقیقی ہے۔اس لیے کہ تاریخ اور روایت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے قارون پر جب عذاب نازل کیا تو زمین پھٹ گئی اور وہ خود اور اس کا وسیع وکثیر خزانہ زمین میں دھنس گیا جس کی چابیاں سینکڑوں خچروں پر لادی جاتی تھیں۔

شعر نمبر 3

طبل وعلم نہ پاس ہے اپنے نہ ملک ومال
ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا

طبل= نقارہ

علم= جھنڈا

یہ دونوں چیزیں شان وشوکت اور کروفر کی علامت سمجھی جاتی ہیں۔شاعر اس شعر میں کہتا ہے کہ ہمارے پاس نہ تو کوئی ملک ہے اور نہ مال ومنال ہے، نہ کہیں کی بادشاہت۔حتیٰ کہ طبل وعلم بھی میسر نہیں جو شان وشکوہ اور کروفر کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ہم تو تہی دست، بے سروسامان اور فقیر منش انسان ہیں ہم جیسے بے مایہ انسان سے دشمنی کر کے اہلِ زمانہ کو کیا حاصل ہوگا۔بادی النظر میں آتش یہ بیان کرتے ہیں کہ دشمنی حسد اور جلن جیسی مکروہ صفات کسی انسان میں دوسروں کی شان وشوکت، دولت وحشمت اور عظمت وسربلندی کو دیکھ ہی پیدا ہوتی ہیں جب کہ شاعر کے پاس تو ایسی کوئی چیز بھی نہیں۔وہ تو جنم جنم کا فقیر ہے اور ایسے بے مایہ، بے آزار اور بے دست وپا شخص سے لوگ دشمنی کر کے کیا پائیں گے؟

شعر نمبر 4

آتی ہے کس طرح سے مری قبض روح کو
دیکھوں تو موت ڈھونڈ رہی ہے بہانہ کیا

قبض روح = روح کا نکلنا

شاعر کہتا ہے کہ انسان کی موت کے لیے کوئی نہ کوئی بہانہ درکار ہوتا ہے۔ کہیں بیماری، کہیں حادثہ، کہیں اور افتاد ہوا کرتی ہے یہاں صورت حال یہ ہے کہ میری حالت سے کوئی ایسی علامت ظاہر نہیں ہوتی جو موت کا سبب بن جائے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آخر میری روح قبض کرنے کے لیے کون سا بہانہ اختیار کرے گی۔ آتش لکھنوی کا یہ شعر مضمون کے لحاظ سے بالکل اچھوتا ہے۔ عموماً شعرا نے موت کا ذکر تو کیا ہے لیکن اس انداز میں نہیں۔ موت سے لوگ گریزاں رہتے ہیں، لیکن صوفی منش آتش یہ دیکھنے کے آرزومند ہیں کہ موت میری روح کو قبض کرنے کے لیے کیا صورت اختیار کرے گی۔

شعر نمبر 5

یوں مدعی حسد سے نہ دے داد، تو نہ دے
آتش غزل یہ تو نے کہی عاشقانہ کیا

مدعی = دعویٰ کرنے والا۔ یہاں مراد رقیب بھی ہے اور شاعرانہ چشمک زنی کرنے والے افراد بھی۔

آتش اپنی غزل کی تعریف کرتے ہوئے یہ واضح کر رہے ہیں کہ میں نے جو داخلی رنگ تغزل اختیار کیا ہے وہ میرے زمانے کے انداز شاعری سے بالکل مختلف ہے۔ اگر میرے رقیب اور دشمن اس عاشقانہ مضمون کی غزل کی داد نہیں دیتے تو نہ دیں۔ اس سے فرق ہی کیا پڑتا ہے۔ اس شعر کے ذریعے آتش دراصل ناسخ اسکول کے ہمنواؤں پر طنز کر رہے ہیں جو خارجی رنگ شاعری کے پرستار تھے اور سچے عاشقانہ جذبات سے انھیں کوئی سروکار نہ تھا۔

3.2 غزل نمبر 2

آئینہ سینہ صاحب نظراں ہے کہ جو تھا
چہرہ شاہد مقصود عیاں ہے کہ جو تھا
راہ میں تیری شب وروز بسر کرتا ہوں
وہی میل اور وہی سنگ نشاں ہے کہ جو تھا
جاں کی تسکیں کے لیے حالت دل کہتے ہیں
بے یقینی کا تری ہم کو گماں ہے کہ جو تھا

اثر منزل مقصودنہیں دنیا میں
راہ میں قافلہ ریگ رواں ہے کہ جو تھا
کون سے دن نئ قبریں نہیں اس میں بنتیں
یہ خرابہ وہی عبرت کا مکاں ہے کہ جو تھا

تشریح

شعرنمبر1

آئینہ سینہ صاحب نظراں ہے کہ جو تھا
چہرہ شاہد مقصود عیاں ہے کہ جوتھا

صاحب نظراں=نظر والے۔حقیقت کوسمجھنے والے

شاہدمقصود=محبوب حقیقی۔خداتعالیٰ

اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ ہمیشہ کی طرح سبھی اہل نظر اور خداشناسوں کے دل آئینہ کی طرح ہیں جن میں خداتعالیٰ کے جلوے عکس فگن ہیں۔یعنی ان کے قلوب آئینہ کی مانند صاف وشفاف ہوتے ہیں جن میں ہمہ وقت خدا کا جمال منعکس ہوتا رہتا ہے۔آتش کی زیرنظرغزل کا یہ مطلع صوفیانہ مضمون کی ایک عمدہ اوراعلیٰ مثال ہے۔پھر کہنے کا شاعرانہ انداز دل کوموہ لینے والالب ولہجہ اوراستعارہ اپنی جگہ خوب ہے۔

شعرنمبر2

راہ میں تیری شب وروز بسر کرتا ہوں
وہی میل اوروہی سنگ نشاں ہے کہ جو تھا

میل=وہ پتھر جو ہرفرلانگ اورکوس کے فاصلے پر کھڑا کردیتے ہیں۔

سنگ نشاں=راستے کے وہ پتھر جن سے فاصلے کا پتہ چلتا ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ میری زندگی تیرے عشق کے راستے پر بسر ہورہی ہے۔اس راہ عشق کے فاصلے وہی ہیں اور سنگ میل بھی وہی ہے۔میں شب وروز راستے پر گامزن ہوں،لیکن عشق کا یہ سفرکبھی ختم نہیں ہوتا۔گویا آتش یہ باورکرارہے ہیں کہ عشق کی منزل کبھی نہیں آتی۔یہاں چلنا مدام ہےاوریہی حقیقت ازلی ہے۔اس سفر میں کوئی تبدیلی رونمانہیں ہوتی کوئی تغیرنمایاں نہیں ہوتاحتیٰ کہ میل سنگ نشاں تک جوں کےتوں رہتے ہیں۔

شعرنمبر3

جاں کی تسکیں کے لیے حالت دل کہتے ہیں
بے یقینی کا تری ہم کو گماں ہے کہ جو تھا

گماں=شک شبہ

شاعر کہتا ہے کہ ہم اپنے دل کی حالت صرف اپنے آپ کو سکون پہنچانے کے لیے بیان کرتے ہیں۔اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ تمھیں (یعنی معشوق کو) یقین دلائیں کیونکہ تمھیں یقین ہی نہیں آ ے گا اور تمھاری بے یقینی کے بارے میں ہمیں ہمیشہ سے شک رہا ہے بادی النظر میں آتش یہ حقیقت بیان کر رہے ہیں کہ دل کی کیفیت سے محبوب کو روشناس کرانے کا مطلب فقط یہی ہے کہ اظہار جذبات کے نتیجے میں خود کو اطمینان قلبی حاصل ہو جائے۔حالت دل کہنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ محبوب کو یقین دلایا جائے کہ شاعر اس کی جدائی میں اور اس کی بے اعتنائی کے سبب کتنے کرب ناک لمحات سے دو چار ہے۔نیز آتش محبوب کے یقین نہ کرنے کے رخ کو بھی اجاگر کر رہے ہیں۔

شعرنمبر4

اثر منزل مقصود نہیں دنیا میں
راہ میں قافلہ ریگ رواں ہے کہ جو تھا

ریگ رواں=سراب

شاعر کہتا ہے کہ دنیا میں کسی کو اپنی منزل مقصود نہیں معلوم نہ ہی اس منزل کا کوئی نشان نظر آ تا ہے۔یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کسی ریگستان میں سراب کا کوئی قافلہ آگے بڑھ رہا ہو۔آتش نے زندگی کی حقیقی کیفیت کو قافلہ ریگ رواں کی صورت میں بیان کیا ہے۔ان کا یہ شعر حد درجہ حکیمانہ اور فلسفیانہ ہے اور ایک ایسے مضمون کو پیش کرتا ہے جو روز ازل سے بڑے بڑے فلسفیوں اور دانشوروں کی توجہ کا مرکز بنا رہا ہے۔

شعرنمبر5

کون سے دن نئی قبریں نہیں اس میں بنتیں
یہ خرابہ وہی عبرت کا مکاں ہے کہ جو تھا

خرابہ=دنیا

عبرت کا مکاں=عبرت کی جگہ

شاعر اس شعر میں کہتا ہے کہ یہ دنیا ہمیشہ کی طرح آج بھی عبرت کی جگہ ہے ہر قدم پر انسان کو احساس ہوتا ہے کہ ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔ کوئی ایسا دن نہیں گزرتا جب نئی نئی قبروں میں انسانوں کو دفن نہ کیا جاتا ہو اور یہ قبریں ہمارے لیے باعث عبرت نہ بنتی ہوں۔ آتش نے بے ثباتی عالم کا نقشہ نہایت پر اثر انداز میں پیش کیا ہے۔

3.3 غزل نمبر 3

موت مانگوں تو رہے آرزوئے خواب مجھے
ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے
دہن گرگ سے جیتا جو بچوں صحرا میں
ذبح کرنے کے لیے مول لے قصاب مجھے
نہیں رکھتے ہیں امیری کی ہوس مرد فقیر
شیر کی کھال ہی ہے قاقم وسنجاب مجھے
فرقت یار میں کرتی ہے قیامت برپا
روز محشر سے نہیں کم شب مہتاب مجھے
نہیں بھولا ہے جنوں میں وہ حواس اڑ جانا
یاد ہے برہمی صحبت احباب مجھے

تشریح

شعر نمبر 1

موت مانگوں تو رہے آرزوئے خواب مجھے
ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

پایاب = کم گہرا ایسا دریا جس میں کم پانی ہو

شاعر اپنی بدنصیبی کا تذکرہ نہایت بلیغ انداز میں کر رہا ہے۔ وہ دراصل یہ بتانا چاہتا ہے کہ اس کی کوئی بھی آرزو پوری نہیں ہوئی۔ حتیٰ کہ اگر موت مانگوں تو خواب میں بھی تمنا پوری نہیں ہوتی اور اگر زندگی سے عاجز ہو کر ڈوبنا چاہوں تو دریا میں اتنا پانی بھی نہ ملے کہ غرق ہو جاؤں۔ انسان کی حرماں نصیبی، مایوسی، نامرادی اور ناکافی کا نقشہ زیر نظر غزل کے مطلع میں نہایت فنکارانہ طور پر پیش کیا گیا ہے۔ زندگی کے اس کرب ناک رخ کو آتش جیسا شاعر نہایت خوب صورت لب و لہجے میں اجاگر کر سکتا تھا۔

شعر نمبر 2

دہن گرگ سے جیتا جو بچوں صحرا میں
ذبح کرنے کے لیے مول لے قصاب مجھے

گرگ = بھڑیے

دہن گرگ = بھڑیے کا منہ

شاعر کہتا ہے کہ میری زندگی بھی کیسی زندگی ہے۔ پے در پے حادثوں کا شکار اور نت نئ مصیبتوں کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے۔ حادثے ہیں کہ مسلسل آئے چلے جا رہے ہیں۔ میری بدنصیبی کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگر میں صحرا میں کسی بھڑیے کا لقمہ بن جانے سے بچ جاؤں تو کوئی نہ کوئی قصاب مجھے خرید کر ذبح کر ڈالے گا مجھے تو کسی حال میں حادثے سے مفر نہیں۔ یہ خوف اور دھڑکا صرف آتش ہی کا نہیں تمام انسانوں کا ہے اور اس طرح اردو کا یہ شعر آفاقی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔

شعر نمبر 3

نہیں رکھتے ہیں امیری کی ہوس مرد فقیر
شیر کی کھال ہی ہے قاقم وسنجاب مجھے

قاقم = ایک سمور دار جانور جس کی کھال استعمال میں آتی ہے۔

سنجاب = ایک جانور کا نام جس کی کھال کی پوستین بنائی جاتی ہے۔

اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ فقیر منش انسان کو دنیا میں امیر بننے کی چنداں ہوس نہیں ہوتی انھیں مال و منال اور جاہ وحشمت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ وہ جس حال میں زندگی بسر کرتے ہیں اسی میں سدا خوش وخرم رہتے ہیں۔ شیر کی معمولی سی کھال ہی ان کے لیے قاقم وسنجاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ آتش نے قناعت پسندی کے آفاقی موضوع کو نہایت موثر انداز میں پیش کیا ہے۔

شعر نمبر 4

فرقت یار میں کرتی ہے قیامت برپا
روز محشر سے نہیں کم شب مہتاب مجھے

شاعر کہتا ہے کہ چاندنی رات تو عموماً لطف وسرور اور سرخوشی سرمستی کا موجب ہوتی ہے لیکن میرے ساتھ ایسا نہیں۔ یہ چاندنی رات میرے لیے وجہ مسرت نہیں بلکہ روز محشر بنی ہوئی ہے۔ اس لیے کہ میرا محبوب میرے پاس نہیں۔ اس کی فرقت میرے لیے سوہان روح ہے۔ ایسے عالم میں یہ شب ماہتاب میرے لیے قیامت سے کم نہیں۔

شعر نمبر 5

نہیں بھولا ہے جنوں میں وہ حواس اڑ جانا
یاد ہے برہمی صحبت احباب مجھے

شاعر کہتا ہے کہ اگر چہ جنون کی حالت میں ہوں، تاہم دوستوں کی محفل کے درہم برہم ہونے کا المناک منظر مجھے بالکل نہیں بھولا ہے اور میں گزشتہ صحبتوں کو یاد کر کے مزید حواس باختہ ہو جاتا ہوں۔ آتش نے بادی النظر میں بے ثباتی عالم کا نقشہ عالم پیش کیا ہے کوئی بھی صحبت یاراں برقرار نہیں رہی اور ہر کیفیت فنا پذیر ہے۔

3.4 غزل نمبر 4

کوچہ دلبر میں میں ،بلبل چمن میں مست ہے
ہر کوئی یاں اپنے اپنے پیرہن میں مست ہے
نشہ دولت سے منعم پیرہن میں مست ہے
مرد مفلس حالت رنج ومحن میں مست ہے
دور گردوں ہے خداوند کہ یہ دور شراب
دیکھتا ہوں جس کو میں اس انجمن میں مست ہے
غافل وہشیار ہیں اس چشم میگوں کے خراب
زندہ زیر پیراہن ، مردہ کفن میں مست ہے
وحشت مجنوں و آتش میں ہے بس اتنا ہی فرق
کوئی بن میں مست ہے کوئی وطن میں مست ہے

تشریح

شعر نمبر 1

کوچہ دلبر میں میں ،بلبل چمن میں مست ہے
ہر کوئی یاں اپنے اپنے پیرہن میں مست ہے

دلبر=معشوق

پیرہن=لباس

آتش نے اس شعر میں زندگی کا فلسفہ پیش کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اگر اپنے معشوق کے کوچے میں مست ہوں اور ہر لمحہ

شاد کام و بامراد رہا ہوں تو دوسری جانب بلبل بھی چمن میں مسرور شاد ماں ہے۔ گویا ہر کوئی کسی نہ کسی حال میں مست اپنی زندگی بسر کر رہا ہے۔ زیرِ نظر غزل کے اس مطلع میں آتش نے انسانی زندگی کی کیفیت پیش کی ہے۔ یعنی انسان جس ماحول اور جس فضا میں رہتا ہے وہاں کے حالات و کیفیات سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔

شعر نمبر 2

نشہ دولت سے منعم پیرہن میں مست ہے
مرد مفلس حالت رنج و محن میں مست ہے

نشۂ دولت = دولت کی فراوانی کا نشۂ

منعم = مال دار۔ دولت مند

شاعر کہتا ہے کہ جس طرح مال دار آدمی اپنی دولت کے نشے میں جھوم رہا ہے اور اس کو سرور و طمانیت میسر ہے، اسی طرح ایک مفلس بھی رنج و غم کی کیفیت میں ہونے کے باوجود اپنی حیات چندروزہ گزار رہا ہے اور حالت زار سے سمجھوتہ کر چکا ہے۔ یہی دراصل فلسفۂ زندگی ہے کہ آدمی ہر حال میں خود کو ڈھال لیتا ہے۔

شعر نمبر 3

دور گردوں ہے خداوند کہ یہ دور شراب
دیکھتا ہوں جس کو میں اس انجمن میں مست ہے

دور = گردش۔ چکر

گردوں = آسمان

انجمن = محفل۔ بزم دنیا

شاعر خدا سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے کہ جس طرح بزم میں شراب کا دور چلتا ہے اور ہر مے کش مخمور نظر آتا ہے کیا اسی طرح فلک کی گردش بھی ہے کہ اس کے پیہم چکر کے نتیجے میں ہر کس و ناکس اپنے حال میں مست نظر آ رہا ہے۔ کیا دور گردوں میں بھی شراب جیسی خاصیت ہے کہ اس کے اثر سے ہر فرد بشر اپنی جگہ سرشار نظر آتا ہے۔

شعر نمبر 4

غافل و ہشیار ہیں اس چشم میگوں کے خراب
زندہ زیر پیراھن ، مردہ کفن میں مست ہے

شاعر نے یہاں محبوب کی شراب دید کا کمال نقشہ کھینچا ہے۔ کوئی اس چشم میگوں کی تاب نہیں لا سکتا اور اپنے حواس

وہوش کھو کر غافل ہو جاتا ہے اور کسی کے لیے ہی آنکھ حیات آفرینی وجاں بخشی کا کام کرتی ہے اور اسے بیدار بنا دیتی ہے۔ گویا چشم میگوں بدحواسی و بیداری ہر دو طرح کی صفات رکھتی ہے۔ اب یہ اپنے ظرف و حوصلے کی بات ہے کہ اسے شراب دید سے کیا میسر آتا ہے۔ یہاں غافل و ہوشیار کو مردہ و زندہ سے یک گونہ نسبت ہے۔

شعر نمبر 5

وحشت مجنوں و آتش میں ہے بس اتنا ہی فرق
کوئی بن میں مست ہے کوئی وطن میں مست ہے

وحشت = دیوانگی

بن = جنگل

وطن = ملک (یہاں مراد گھر)

شاعر کہتا ہے کہ مجنوں اور آتش دونوں عالم دیوانگی میں ہیں۔ دونوں پر وحشت طاری ہے۔ اگر کوئی فرق ہے تو یہ کہ اول الذکر جنگل میں بڑا وحشت کے دن بسر کر رہا ہے اور آخر الذکر اپنے گھر میں مجنونانہ زندگی گزار رہا ہے۔ دونوں کی زندگی میں یہ قدر مشترک ہے۔ دونوں اپنے اپنے حال میں مست دکھائی دیتے ہیں۔ دونوں کیفیت ایک جیسی ہے۔ اگر فرق ہے تو بس اتنا کہ مجنوں بن میں مارا مارا پھر رہا ہے اور آتش اپنے گھر مقیم ہے۔ وگرنہ دونوں اپنی اپنی جگہ مست ہیں۔

3.5 غزل نمبر 5

اے صنم جس نے تجھے چاند سی صورت دی ہے
اسی اللہ نے مجھ کو بھی محبت دی ہے
فرقت یار میں رو رو کے بسر کرتا ہوں
زندگانی مجھے کیا دی ہے ،مصیبت دی ہے
یاد محبوب فراموش نہ ہووے اے دل
حسن نیت نے مجھے عشق سی نعمت دی ہے
گوش پیدا کیے سننے کو تراذکر جمال
دیکھنے کو ترے آنکھوں میں بصیرت دی ہے
تیغ بے آب ہے بے بازوئے قاتل کمزور
کچھ گراں جانی ہے کچھ موت نے فرصت دی ہے

تشریح

شعر نمبر 1

اے صنم جس نے تجھے چاند سی صورت دی ہے
اسی اللہ نے مجھ کو بھی محبت دی ہے

صنم = محبوب

اس شعر میں شاعر محبوب سے مخاطب ہو کر یہ کہہ رہا ہے کہ اگر خدا نے تمھیں حسین و جمیل بنایا ہے تو اسی خالق مطلق نے میرے (عاشق کے) دل میں محبت کا جذبہ بھی پیدا کیا ہے۔ لہٰذا میں تمھاری چاند سی صورت پر فریفتہ ہوں تو یہ کوئی انہونی سی بات نہیں بلکہ عین قانون فطرت ہے۔ اس لیے تمھیں میرے جذبہ عشق سے نہ تو بیزار ہونا چاہیے نہ ہی کبیدہ خاطر۔ میں جو بھی عمل کر رہا ہوں وہ تقاضائے فطرت ہے۔

شعر نمبر 2

فرقت یار میں رو رو کر بسر کرتا ہوں
زندگانی مجھے کیا دی ہے، مصیبت دی ہے

زندگانی = زندگی

اس شعر میں شاعر اپنی زندگی کی سچی تصویر پیش کر رہا ہے۔ کہتا ہے کہ محبوب کی جدائی میں آہ وزاری کرنے کے سوا میرا کوئی اور مشغلہ نہیں! رو رو کر بے حال ہوا جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ زندگی، زندگی نہیں ایک مصیبت ہے بادی النظر میں آتش اپنی حرماں نصیبی اور غم انگیز زندگی کا نوحہ بیان کر رہے ہیں اور در پردہ مالک ارض وسما سے شکوہ کناں بھی ہیں۔

شعر نمبر 3

یاد محبوب فراموش نہ ہووے اے دل
حسن نیت نے مجھے عشق سی نعمت دی ہے

حسن نیت = اچھی اور نیک نیت

شاعر اپنے دل سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ تجھے جو عشق کی نعمت ملی ہے، اس کی قدر کر۔ یہ کوئی ادنیٰ اور معمولی شے نہیں۔ یہ تو تیرے ہی حسن نیت کا ثمر ہے۔ لہٰذا جذبہ عشق کا ہر حال میں بھرم رکھ اور اس کی قدر دانی کر۔ بایں ہمہ محبوب کی یاد کو کسی حال میں بھی فراموش کرنا تجھے زیبا نہیں!

شعرنمبر4

گوش پیدا کیے سننے کو ترا ذکر جمال
دیکھنے کو ترے آنکھوں میں بصیرت دی ہے

گوش=کان

ذکر جمال=محبوب کی خوب صورتی کا بیان

بصیرت=روشنی،دانش

شاعرمحبوب سے کہتا ہے کہ اللہ نے مجھے یہ کان اس لیے دیے ہیں کہ ان سے میں تیرے حسن و جمال کا تذکرہ سنوں اوراسی طرح آنکھوں میں روشنی دی ہے کہ ان سے تیرا روئے زیبا دیکھوں۔اگر میں اپنے کان اور اپنی آنکھ کا مصرف نہ لوں تو یہ کفران نعمت ہوگا۔لہٰذا تو مجھے اپنے حسن و جمال کا تذکرہ سننے دے اور رخ منور کو دیکھنے میں حارج نہ ہو۔

شعرنمبر5

تیغ بے آب ہے بے بازوئے قاتل کمزور
کچھ گراں جانی ہے کچھ موت نے فرصت دی ہے

تیغ=تلوار

بےآب=کند

شاعر کہتا ہے کہ میں محبوب کی تلوار کے سامنے زندہ کھا ہوں تو اس کی وجہ میری سخت جانی بھی ہے اور موت نے بھی کچھ مہلت کچھ وقت دے رکھا ہے۔ورنہ نہ تو اس کی تلوار کند ہے اور نہ ہی وہ ایسا کم زور ونا تواں ہے کہ تلوار کا وار نہ کر سکے۔گویا اس عشق میں میرا بچنا کسی معجزے سے کم نہیں۔

4۔ خود آزمائی

سوال نمبر 1 آتش کی غزلوں میں عشق کی گرمی اور جذبات کی حرارت پائی جاتی ہے۔ مثالوں سے اپنا نقطۂ نظر واضح کریں۔

سوال نمبر 2 کیا یہ صحیح ہے کہ تاثیر اور دردمندی کے اعتبار سے آتش کی غزل کے بہت سے اشعار میر کے ہم پلہ ہیں؟

سوال نمبر 3 آتش کے کلام کا غالب حصہ رجائیت سے لبریز ہے۔ اس کلیے سے بحث کیجیے۔

سوال نمبر 4 آتش کی شاعری میں صوفیانہ پہلو خاصا نمایاں ہے۔ آپ اس قول سے کہاں تک متفق ہیں؟

سوال نمبر 5 خواجہ حیدر علی آتش کی مختصر سوانح تحریر کیجیے۔

سوال نمبر 6 آتش لکھنوی کی غزلوں سے اپنی پسند کے 5 اشعار لکھ کر ان کی تشریح کیجیے۔

5۔ مجوزہ کتب برائے مطالعہ

1۔ خواجہ حیدر علی آتش، کلیات آتش، مرتبہ: سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، مجلس ترقی ادب لاہور، 1975ء

2۔ فراق گورکھپوری، اردو غزل گوئی، نصرت بک ڈپو، لکھنو، 1998ء

3۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان، اردو غزل، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دلی، 1952ء

4 ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، لکھنو کا دبستان شاعری، غضنفر اکیڈمی، کراچی، 1987ء

5۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، ولی سے اقبال تک، چمن بک ڈپو، دلی، 1985ء

6۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، تاریخ اردو ادب، (جلد دوم) مجلس ترقی ادب، لاہور، 1994ء

7۔ محمد ذاکر، خواجہ حیدر علی آتش، ساہتیہ اکیڈمی، دہلی، 1989ء

یونٹ نمبر 5

غزلیاتِ مومنؔ

تحریر: ڈاکٹر محمود الرحمٰن
نظرِ ثانی: پروفیسر ڈاکٹر محمد کامران

فہرست

یونٹ کا تعارف

عزیز طلبہ و طالبات!

آپ اس یونٹ میں اردو کے ممتاز غزل گو اور غالب کے ہم عصر شاعر حکیم مومن خان مومنؔ کی زندگی اور ان کے رنگ تغزل کے بارے میں پڑھیں گے، نیز ان کی پانچ غزلوں کا جائزہ لیں گے۔ یہاں یہ حقیقت واضح کر دی جائے کہ مومنؔ شعرائے اردو میں ایک خاص درجہ رکھتے ہیں۔ ان کا کلام نازک خیالی اور بلندی پرواز ی کے لیے شہرہ آفاق ہے ان کی تشبیہیں اور استعارے بالکل ہی غیر معمولی اور چونکا دینے والے ہوتے ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مومن کی شاعری میں الفاظ کا ایک ایسا طلسم ہے جس سے قاری مسحور ہوئے بغیر نہیں رہتا مثلاً یہ شعر:

اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

یونٹ کے مقاصد

امید کی جاتی ہے کہ اس یونٹ کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہوسکیں گے کہ:

۱۔ مومن کی سوانح عمری سے واقف ہوسکیں۔

۲۔ ایک غزل گو کی حیثیت سے مومن کی اہمیت بیان کرسکیں۔

۳۔ مومن کی غزلوں کو سمجھ کر ان کی تشریح کرسکیں۔

1۔ مومنؔ خان مومنؔ

(1800ء۔1851ء)

1.1 سوانح

محمد مومن خان نام تھا اور مومن تخلص 1215ھ مطابق 1800ء میں دہلی کے محلّہ کوچہ چیلان میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا حکیم ناوار خان شاہ عالم کے عہدِ حکومت میں کشمیر سے ہجرت کر کے دہلی آئے اور یہیں سکونت اختیار کی۔ ان کی طبابت کا شہرہ سن کر بادشاہ نے شاہی طبیبوں میں شامل کرلیا اور ان کی بے بہا خدمات کے صلے میں جاگیر عطا کی۔

مومن کے والد حکیم غلام نبی خان دہلی کے مشہور طبیبوں میں شمار ہوتے تھے۔ انھیں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ سے بے حد عقیدت تھی۔ حضرت شاہ عبدالعزیز نے ہی مومنؔ کی پیدائش کے موقع پر مومن کے کان میں اذان دی اور مومن خان نام رکھا۔ ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ جب ذرا ہوش سنبھالا تو مولانا شاہ عبدالقادرؒ سے عربی کی کتابیں پڑھیں۔ گویا مومن خان نے درسیات کی تکمیل ایک ایسے گھرانے میں کی جو ایک مدت تک دلی میں اپنے علم و فضل کے سبب معزز و ممتاز رہا تھا۔

درسیات کی تکمیل کے بعد مومن نے اپنے والد حکیم غلام نبی خان اور اپنے دو چچا حکیم غلام حیدر خان اور حکیم غلام حسن خان سے طب کی کتابیں پڑھیں اور اپنے آبائی مطب میں ان خاندانی بزرگوں کی زیرِ نگرانی نسخہ نویسی کی۔

اسی زمانے میں انھیں علم نجوم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ اس کو بھی اس زمانے کے اہلِ کمال سے حاصل کیا اور مہارت بہم پہنچائی۔ مومن کو اس فن میں ایسا ملکہ تھا کہ بڑے بڑے منجم اور جوتشی حیران و ششدر رہ جاتے۔ حافظے کا یہ عالم تھا کہ سال میں صرف ایک بار تقویم دیکھ لیتے اور پورے بارہ ماہ تک تمام ستاروں کے مقام اور کیفیات و اثرات ان کے ذہن میں محفوظ رہتے۔

علم نجوم کی طرح فن موسیقی سے بھی مومن خان کو شغف تھا۔ اس میں وہ نام پیدا کیا کہ لوگ ان کے کمال کے معترف ہوگئے۔ شطرنج سے بھی ان کو کمال مناسبت تھی۔ جب کھیلنے بیٹھتے تو دنیا و مافیہا کی کوئی خبر نہ رہتی اور تمام ضروری کام بھول جاتے۔

مومنؔ اگرچہ کئی علوم وفنون میں دسترس رکھتے تھے، لیکن اپنی زندگی میں سب سے زیادہ دلچسپی انھوں نے شعروشاعری میں لی تھی اور یہی چیز ان کی دائمی شہرت اور نام و نمود کا ذریعہ بنی۔

1.2 محاسن کلام

مومن کو شعروشاعری سے طبعی مناسبت تھی۔ جہاں ان کے عاشقانہ مزاج نے اس فطری شوق کو ہوا دی وہاں دلی ماحول نے بھی مہمیز کا کام کیا۔ مومن کے عہد میں دلی اردو غزل کا مرکز تھی۔ غالب، ذوق، بہادر شاہ ظفر، صہبائی، مجروح اور شیفتہ جیسے بلند پایہ شاعر غزل سرائی کر رہے تھے جو سچ پوچھیے تو میر وسودا کی طرح یہ عہد بھی اردو غزل کے لیے نہایت سازگار

اور تابناک تھا۔اسی شاعرانہ ماحول میں ان کی شاعری کا آغاز ہوا۔ابتدا میں شاہ نصیر کا اپنا کلام دکھایا اور ان سے اصلاح لی۔

مومن کے کلام کا بیشتر حصہ غزلیات اور مثنویوں پر مشتمل ہے۔ یوں تو وہ قادرالکلام شاعر تھے اور غزل،قصیدہ،رباعی،مثنوی، تاریخ،معمہ،سب ہی اصناف سخن میں طبع آزمائی کی تھی لیکن غزل اور مثنوی سے انھیں خاص مناسبت تھی۔

مومن اپنی زندگی کے تقریباً 52 سال گزار چکے تھے کہ ایک دن کوٹھے سے گر پڑے اور چند ماہ بعد 1268ھ مطابق 1851ء میں وفات پا گئے۔اپنے مرنے کی تاریخ خود لکھی تھی۔

(''دست وبازو بہ شکست 1268ھ'')

مومن بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ انھوں نے غزل گوئی کے اس ماحول میں پرورش پائی تھی جہاں سر برآوردہ شعرا اپنے کلام کا جادو جگا رہے تھے۔پھر انھوں نے جس تہذیب اور معاشرت میں زندگی بسر کی وہ پوری طرح ان کی شاعری میں رچی بسی ہوئی ہے لیکن اس رنگ معاشرت نے ان کے فکروفن میں عمومیت اور سوقیانہ پن پیدا نہیں کیا،اس لیے کہ مومن انفرادی شخصیت کے مالک تھے اور یہ خصوصیت ان کی غزل گوئی میں بدرجہ اتم موجود ہے۔گویا اس طرح صنف غزل میں مومن انفرادی مقام کے حامل ٹھہرے۔

اردو شاعری میں جس طرح میر اپنے سوز وگداز ،درد اپنے صوفیانہ رنگ اور غالب اپنے مفکرانہ انداز کے لیے معروف ہیں،اسی طرح مومن بھی اپنی نازک خیالی''معنی آفرینی اور بلند پروازی کے لیے ضرب المثل ہیں۔حتیٰ کہ اردو ادب کے بعض نقاد تو انھیں نازک خیالی کا بادشاہ قرار دیتے ہیں۔

1.3 تصورمحبوب

مومن کی شاعری عشق مجازی کی پرزور اور پراثر داستان ہے۔اس میں حرماں نصیب اور فرقت زدہ عاشق کی کیفیات نہایت نادر اور اثر انگیز انداز میں بیان ہوئی ہیں۔مومن نے واردات حسن وعشق کے اظہار میں ایسی حیرت انگیز جدت اور تنوع سے کام لیا ہے کہ ہر شعر ناز وغمزہ ادا کی مصوری،جذبہ رقابت کی نشاندہی،ادابندی اور معاملہ نگاری میں یکتا نظر آتا ہے۔

نازک تشبیہات،نادر استعارات اور بلند تخیلات مومن کی غزل گوئی کا اصلی جوہر ہیں۔حقیقی جذبات نگاری میں انھیں ید طولیٰ حاصل ہے۔وہ فارسی کی دل فریب ترکیبیں بڑی خوبی سے استعمال کرتے ہیں جس سے ان کی شاعری میں دلفریبی پیدا ہو جاتی ہے۔غرض،ان کی غزلوں میں دلکشی اور چاشنی ہے،ترنم اور نغمگی ہے حسن وعشق کا والہانہ انداز بیان ہے،صداقت وخلوص کی کارفرمائی ہے،پامال مضامیں سے اجتناب رہے اور جدت طرازی نکتہ آفرینی ہے۔

مومن افق شاعری میں آفتاب وماہتاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان کے رنگ تغزل پر کسی رجحان کی چھاپ لگانی مشکل ہے۔وہ اپنے لہجے میں منفرد اور اسلوب کے آپ مالک ہیں۔ان کی شاعری اپنے ہم عصر شعرا سے بالکل مختلف ہے

۔مومن کے یہاں دقیق تراکیب اور مشکل الفاظ کثرت سے ملتے ہیں۔ان کی غزل سراپا تخیل ہے۔ان کا اسپ خیال بام عرش تک جا پہنچتا ہے۔

بایں ہمہ،مومن کے بیشتر اشعار جذبے سے خالی ہوتے ہیں۔البتہ ان کے منتخب اشعار کا جواب نہیں۔مومن کے مضامین معاملات وحسن وعشق تک محدود ہیں۔وہ صنف غزل کو تصوف اور اخلاق وفلسفے سے گرانبار کرنا پسند نہیں کرتے۔ان کی انفرادیت کافی حد تک ان کے اسلوب اور دوررس تخیل میں پنہاں ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے مومن کے تصور محبوب کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

> ''مومن کی ساری غزلوں میں محبوب اپنے پورے وجود کے ساتھ سامنے آتا ہے۔وہ اس کی ہر ہر ادا کو اس کی چال کو، اس کی آنکھوں اور ہنسنے کو، اس کی حیا اور اس کی آواز کو دل رُبائی اور سچے جذبے کے ساتھ شائستگی کے دائرے میں رہتے ہوئے بیان کرتے ہیں، اور اپنے سارے وجود کو محبوب کے سپرد کر دیتے ہیں۔ان کی شاعری میں جیسا زندہ، جیتا جاگتا محبوب سامنے آتا ہے ویسا اردو شاعری میں خال خال نظر آتا ہے۔''
>
> (تاریخ ادب اردو، جلد چہارم، مجلس ترقی ادب، ۲۰۱۲ء، ص ۳۶۰)

واضح رہے کہ واردات حسن وعشق کا اظہار اردو شاعری میں کوئی نئی چیز نہیں۔ایک متلون مزاج سے محبت اور پھر اس کے جملہ لوازمات، مثلاً ناز وادا اور غمزہ کی بھرپور مصوری، اپنے جذبہ رقابت کی نشان دہی، ادابندی اور معاملہ نگاری۔لیکن مومن نے اس محدود دائرے میں رہ کر ایسی حیرت انگیز جدت اور تنوع سے کام لیا کہ ان کا ہر شعر تازہ کار اور تازہ خیال معلوم ہوتا ہے۔

1.4 نفسیاتی رموز اور مومن

غالب کی طرح مومن کے یہاں بھی یہ خصوصیت پائی جاتی ہے کہ وہ کسی واقعہ کے بیان میں درمیانی کڑیوں کو چھوڑ جاتے ہیں، لیکن ابتدا اور انتہا کو اس طرح منسلک کرتے ہیں کہ پڑھنے والا ان مخذوفات کو خود بخود مکمل کر کے کیفیت شعری میں شاعر کا شریک ہو جاتا ہے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مومن نے غزل کے صحیح ماحول میں پرورش پائی تھی ان کی ذہنی شعری نشو ونما میں اس مخصوص تہذیبی اور معاشرتی ماحول کا ہاتھ ہے جس نے غزل کی صنف کو پروان چڑھایا ہے اور جو خود غزل کے ہاتھوں پیدا ہوا ہے۔یہی وجہ ہے کہ مومن کے تغزل میں اس تہذیب ومعاشرت کا مزاج پوری طرح بے نقاب ہے جس کے سائے میں انھوں نے زندگی بسر کی تھی اور جس کی خصوصیات خود ان کے مزاج میں پوری طرح رچ بس گئی تھیں۔

لیکن مذکورہ بالا صورت حال نے ان کی غزلوں میں عمومیت، یکسانیت اور یک رنگی نہیں پیدا کی۔مومن صحیح معنوں میں بڑی انفرادیت ان کی غزلوں میں اپنا بھرپور جلوہ دکھاتی ہے۔اس کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ مومن محض قافیہ پیمائی کے شاعر

نہیں ان کے کلام میں ان کے ذاتی اور انفرادی تجربات کا لہو موجزن ہے۔ یہی سبب ہے کہ مومن کی غزلوں میں نئی زندگی نظر آتی ہے اور ایک نیا روپ دکھائی دیتا ہے جو قدم قدم پر دامن دل کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ مومن کے انفرادی اور ذاتی تجربے کی صداقت صحیح جمالیاتی اقدار کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر ان کی غزلوں کو ایک کرشمہ بنا دیتی ہے جو دیکھنے والے کے دل کو لبھاتا ہی نہیں اس کو چونکاتا بھی ہے۔

غزل، مومن کی ذہانت اور طباعی نے ان کی غزلوں کو دلفریب بنا دیا ہے۔ نکتہ طرازی، رفعت تخیل اور جدت ادا ان کے کلام کی خصوصیت ہیں۔ ان کی غزلیہ شاعری میں ایک دلکشی اور چاشنی ہے، ترنم اور نغمگی ہے۔ عاشقانہ جذبات اور معاملات حسن وعشق کا والہانہ انداز بیان ہے، جس میں صداقت وخلوص ہے فکر، کی بلندی کے ساتھ فن کا رچاؤ ہے۔ مومن اول تو پامال مضامین سے بھی اجتناب کرتے ہیں اور اگر کہیں کسی پامال مضمون کو لاتے بھی ہیں تو ان کی جدت اسے ایک نیا روپ عطا کر دیتی ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔

اس امر میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ مومن نے حسن وعشق کے راز و نیاز، تنگنائے غزل میں سمونے کی کوشش کی اور تغزل کا وہ معیار قائم کیا کہ آج بھی جاذب توجہ بنا ہوا ہے۔

یہ کہنا حق بجانب ہوگا کہ مومن خان مومنؔ کی غزلوں نے اردو غزل کی روایت کو نئی راہوں پر لگایا اور تغزل کا وہ معیار قائم کیا کہ آج بھی جاذب توجہ بنا ہوا ہے۔ علامہ نیاز فتح پوری کی مندرجہ ذیل رائے مومن کی غزل گوئی کے جملہ اوصاف کو عیاں کر رہی ہے۔

> ''مومن انداز بیان کا تیکھا پن، معاملات حسن وعشق کی صحیح ترجمانی، لطیف طنزیہ انداز، ان تمام خصوصیات کی بنا پر اپنے تمام ہم عصر شعرا سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ میرے خیال میں مومن ہی ایک ایسا شاعر ہے جو نفسیاتی رموز کو سمجھ کر شاعری کرتا ہے اور ایسی معنوی ترکیبیں پیدا کرتا ہے کہ غور سے تجزیہ کرنے کے بعد ان کا پتا چلتا ہے۔''

(انتقادیات، حصہ اول، عبدالحق اکیڈمی حیدرآباد دکن، ۱۹۴۴ء، ص ۲۹)

مومن اردو شعرا میں بڑی پہلودار شخصیت کے مالک تھے اور ان کی یہ پہلودار شخصیت اس بات کی متقاضی تھی کہ ان کے حالات کی تفصیل و جزئیات کا سراغ لگایا جاتا، لیکن افسوس کہ مومن کو اپنے کمال فن کے اظہار و نمود کے لیے کوئی آزاد ملا نہ کوئی حالیؔ!

2۔ اہم نکات

1۔ شعرائے اردو میں مومن ایک خاص درجہ رکھتے ہیں۔

2۔ وہ صاحب طرز غزل گو تھے۔

3۔ ان کا کلام نازک خیالی اور بلند پروازی کے لیے شہرآفاق ہے۔

4۔ ان کی تشبیہیں اور استعارے بالکل غیر معمولی ہوتے ہیں۔

5۔ ان کے یہاں الفاظ کا طلسم ہے۔

6۔ مومن نے حسن وعشق کے راز ونیاز تنگائے غزل میں سمونے کی کوشش کی ہے۔

7۔ انھوں نے تغزل کا وہ معیار قائم کیا کہ آج بھی جاذب توجہ بنا ہوا ہے۔

3۔ تشریحات

3.1 غزل نمبر (1)

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا
رنج راحت فزا نہیں ہوتا
بے وفا کہنے کی شکایت ہے
تو بھی وعدہ وفا نہیں ہوتا
تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
کیوں سنے عرض مضطرب مومن
صنم آخر خدا نہیں ہوتا

تشریح

شعر نمبر 1

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا
رنج راحت فزا نہیں ہوتا

راحت فزا= آرام پہنچانے والا

محبت میں سوائے رنج کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا اور رنج کا کام راحت و آرام پہنچانا نہیں۔ بلکہ تکلیف دینا ہے لیکن یہ بات محبت کرنے والے کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اس کو جتنا سمجھاؤ بے سود ہے۔

دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ محبوب کی بے وفائی عاشق کے دل پر چرکے لگاتی ہے۔ وہ رنج وغم میں مبتلا رہتا ہے۔لیکن اس حقیقت کے باوجود معشوق کے دل پر عاشق کی حالت زار کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔اس کا غم برقرار رہتا ہے اور آرام پہنچنے کی کوئی سبیل نہیں نکلتی۔

شعر نمبر 2

بے وفا کہنے کی شکایت ہے
تو بھی وعدہ وفا نہیں ہوتا

وعدہ وفا = وعدہ پورا کرنے والا

شاعر کہتا ہے کہ عاشق نے محبوب کے ظلم وستم سے تنگ آ کر اسے ''بیوفا'' کہہ دیا جس پر بگڑ گیا اور شکایت کی کہ یہ سراسر الزام تراشی ہے۔ شاعر دراصل اس حقیقت کی وضاحت کرنا چاہتا ہے کہ وہ محبوب اس درجہ ظالم اور سنگدل ہے کہ اسے بے وفا کا خطاب سننا بھی گوارا نہیں اور دوسری طرف اس کا یہ عالم ہے کہ وہ وعدہ پورا کرنا بھی نہیں چاہتا۔ وہ اپنی بے رخی، بے اعتنائی اور بے توجہی سے عاشق کو مسلسل زک پہنچائے چلا جاتا ہے۔ اس تلخ حقیقت کے باوجود یہ ظالم یہ امید بھی رکھتا ہے کہ اسے ''باوفا'' سمجھا جائے اور ہرگز ''بے وفا'' کہہ کر مخاطب نہ کیا جائے۔

شعر نمبر 3

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

دنیا میں تمام دلچسپیاں محبوب کی ذات سے وابستہ ہیں۔ اگر محبوب اپنا نہیں تو یہ دنیا اپنی رنگینیوں کے باوجود اجاڑ معلوم ہوتی ہے۔ اس خیال کا اظہار کرتے ہوئے مومن کہتے ہیں کہ اگر دنیا میں کچھ بھی نہ ہوتا مگر اس کا محبوب اس کا بن جاتا تو اس کے لیے یہی سب کچھ تھا۔ لیکن لاکھ جتن کرنے کے بعد محبوب اپنا نہ ہوسکا۔ حالانکہ دنیا میں ہر کام آخر انجام پا ہی جاتا ہے اور ہر گتھی سلجھ ہی جاتی ہے۔

شعر نمبر 4

تم مرے پاس ہوتے ہو گیا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

پہلے مصرعہ کے لفظ ''گویا'' اور دوسرے مصرعہ کے پہلے لفظ ''جب'' کو ملا کر پڑھنے پر مطلب آسانی سے سمجھ میں آ جائے گا۔ یعنی اس کی یوں نثر کر لیجیے، تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب، دوسرا نہیں ہوتا۔

یہ مومن کا بہت ہی مشہور شعر ہے۔ اس شعر کے متعلق الطاف حسین حالی نے لکھا ہے کہ غالب مومن خان کو اپنا دیوان اس کے عوض دینے کو تیار ہے۔

قابل تعریف بات ''گویا'' کی ذومعنویت میں ہے شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ جس وقت وہ اپنے تصور میں اپنے محبوب

سے محوکلام ہوتا ہے۔''اس وقت اس کوکسی اور کا خیال نہیں آ تا۔لیکن سوال یہ ہے کہ کیا محبوب صرف کسی خاص وقت ہی عاشق کے دل میں ہوتا ہے؟نہیں ! وہ تو ہر وقت اس کی نظروں میں سمایا اور اس کے تصور میں موجود رہتا ہے۔اس لیے مطلب یہ ہوا کہ میں اپنے محبوب سے ہر وقت ہم کلام رہتا ہوں اور کسی دوسرے کے خیال کا بھی گزر ممکن نہیں۔

شعرنمبر5

کیوں سنے عرض مضطرب مومن
صنم آخر خدا نہیں ہوتا

صنم = بت۔کنایۃً محبوب

شاعر کہتا ہے کہ مومن کی بے چینی کا حال اور اس کی فریاد کو بھلا صنم یا محبوب کیوں سنے گا۔آخر وہ تو پتھر ہے،صنم ہے۔خدا تو نہیں! سننا تو خدا کا کام ہے۔محبوب کو صنم اس وجہ سے کہا ہے کہ صنم عموماً پتھر کا ہوتا ہے اور محبوب بے حس ہے،یعنی پتھر کی مانند سخت دل ہے۔بادالنظر میں شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ صنم عاشق کی حرماں نصیبی اور رنج فرقت کی جانب کبھی ترحم کی نظر سے نہ دیکھے گا اور نہ ہی اس کی آہ و بکا کو سننے کی زحمت گوارا کرے گا۔لہٰذا اس سے کسی نیکی اور بھلائی کی توقع کر لینا حماقت ہے۔محبوب نہ کبھی رام ہوا ہے اور نہ کبھی ہوگا۔

3.2 غزل نمبر2

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا
دشنام یارِ طبع حزیں پر گراں نہیں
اے ہم نفس نزاکت آواز دیکھنا
مت رکھیو گردِ تارک عشاق پر قدم
پامال ہو نہ جائے سرافراز دیکھنا
کشتہ ہوں اس کی چشم فسوں گر کا اے مسیح
کرنا سمجھ کے دعویٰ اعجاز دیکھنا
ترک صنم بھی کم نہیں سوز جحیم سے
مومن غم مآل کا آغاز دیکھنا

شعر نمبر 1

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا

غمزہ=عشوہ۔ادا۔ پیار بھری نظر

غماز=آنکھ سے اشارہ کرنے والا

غیر=رقیب

شاعر اپنے محبوب سے مخاطب ہو کر یہ کہہ رہا ہے کہ مجھے تم سے جو دلی محبت ہے اس کا علم رقیبوں کو نہیں ہے اور یہی بات ہم دونوں کے حق میں بہتر ہے لیکن اس راز کے افشا ہونے کا احتمال یوں ہے کہ تم محفل میں میری جانب نہیں دیکھتے بلکہ تمھاری نگاہ اوروں پر رہتی ہے۔اس میں خدشہ ہے کہ رقیب ہمارے آپس کے تعلقات کا بھانپ لیں گے۔

مومن نے اس شعر میں نفسیاتی کیفیت بیان کی ہے۔محبوب اپنے عاشق کی جانب بالکل توجہ نہیں کرتا۔ چنانچہ اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرنے کے لیے یہ کہا جا رہا ہے کہ میری طرف بھی دیکھ لو، وگرنہ اہل محفل ساری حقیقت تاڑ لیں گے۔

شعر نمبر 2

دشنامِ یارِ طبعِ حزیں پر گراں نہیں
اے ہم نفس نزاکت آواز دیکھنا

دشنام=گالی

طبع حزیں=مغموم طبیعت

مومن کہہ رہے ہیں کہ محبوب اگرچہ مجھے گالی دے رہا ہے اور برا بھلا کہہ رہا ہے، پھر بھی میری مغموم طبیعت پر یہ گراں نہیں اس لیے کہ یہ دشنام طرازی جس دلنشیں آواز میں ہو رہی ہے وہ مجھے پسند ہے۔اس گالی دینے والے کی آواز تو سنو اس کی نزاکت پر غور کرو کیا لے اور نغمگی ہے کیا حسن اور دلنشینی ہے۔ایسے میں گالی کی تلخی کیوں کر قائم رہے۔

شعر نمبر 3

مت رکھیو گردِ تارک عشاق پر قدم
پامال ہو نہ جائے سرافراز دیکھنا

تارک=سر کھوپڑی

عشاق=عاشق کی جمع

سرفراز=معزز۔عالی مرتبہ

پامال=روندا ہوا۔تباہ۔شدہ پاؤں سے مسلا ہوا

شاعر معشوق سے کہہ رہا ہے کہ تمھاری بے رخی اور بے اعتنائی کی وجہ سے عاشق تباہ و برباد ہو گیا۔خاک میں مل گیا اس کا کاسئہ سر بھی زمیں بوس ہو گیا اور اس پر خاک کی تہہ جم گئی۔تم چلنے میں ذرا احتیاط کرو کہ کہیں قدم محبؔ کے سر پر پڑی ہوئی خاک کے اوپر نہ آ جائے اور اس طرح روندے ہوئے اور تباہ شدہ سر کو اعزاز حاصل ہو جائے۔اس شعر میں طنز کا پہلو بھی ہے کہ ساری زندگی تو عاشق کو پامال کرتے رہے۔اب اس کی گردسر پر قدم رکھ کر کیوں اعزاز بخش رہے ہو؟

شعر نمبر 4

کشتہ ہوں اس کی چشم فسوں گر کا اے مسیح

کرنا سمجھ کے دعویٰ اعجاز دیکھنا

کشتہ=قتل کیا ہوا۔مارڈالا ہوا

فسوں گر=جادوگر۔ساحر

چشم فسوں گر=جادو کرنے والی آنکھ

اعجاز=معجزہ کرامت،کرشمہ

مسیح=حضرت عیسٰیؑ کا لقب،کنایۃً حکیم حاذق کے لیے بولتے ہیں۔

شاعر اپنے مسیحا سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے کہ تمھیں اپنی مسیحا نفسی پر بڑا ناز ہے اور یہ دعویٰ بھی کرتے ہو کہ ہر بیماری کا علاج تمھارے پاس ہے لیکن میں تم کو بتا دوں کہ میں اپنے محبوب کی جادو بھری آنکھوں کا گھائل ہوں۔اسی کی وجہ سے میں اس حال کو پہنچا ہوں اور تم معجزہ دکھانے اور مجھے صحت مند کرنے کا جو دعویٰ کر رہے ہو اس معاملے میں ذرا سوچ سمجھ کر کام لینا۔ایسا نہ ہو کہ تمھاری ساری کرامت دھری کی دھری رہ جائے۔بادی النظر میں مومن یہ بتانا چاہتے ہیں کہ تیرِ نظر کے زخمی کا علاج ممکن نہیں۔

شعر نمبر 5

ترکِ صنم بھی کم نہیں سوزِ جحیم سے

مومن غمِ مآل کا آغاز دیکھنا

جحیم=دوزخ۔جہنم

غم مآل=غم کا انجام

صنو=محبوب

محبت کے ایک اہم فلسفے کو بیان کیا جا رہا ہے کہتے ہیں کہ صنم سے عشق کرنے کو تو کر گئے لیکن اس کے نتیجے میں رنج وفکر ومحن کے سوا کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔محبوب کی مسلسل بے رخی اور بے وفائی نے زندگی کو اجیرن کر دیا اور اب اس سے علیحدگی اختیار کرنے کو دل چاہتا ہے لیکن یہ کام بھی آسان نہیں ۔ترک الفت دوزخ کی آگ سے کم نہیں۔محبت کی وجہ سے جس انجام تک پہنچے اب اس کے آغاز کے بارے میں سوچنا بھی سوہانِ روح ہے۔

3.3 غزل نمبر3

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہوگئے ناچار جی سے ہم
ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم
منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بے کسی سے ہم
ہم سے نہ بولو تم اسے کیا کہتے ہیں بھلا
انصاف کیجیے پوچھتے ہیں آپ ہی سے ہم
اس کو میں جامریں گے مدد اے ہجومِ شوق
آج اور زور کرتے ہیں بے طاقتی سے ہم
ان ناتوانیوں پہ بھی تھے خارِ راہِ غیر
کیوں کر نکالے جاتے نہ اس کی گلی سے ہم

تشریح

شعر نمبر 1

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہوگئے ناچار جی سے ہم

ٹھانی تھی = پکا ارادہ کیا تھا

ناچار = مجبور

ہم نے اپنے دل میں یہ پکا ارادہ کیا تھا کہ اب معشوق سے نہیں ملیں گے۔اس کے رویے، بے رخی اور بے اعتنائی نے ہی ہمیں یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کیا تھا،لیکن دل میں محبت کی جو چنگاری سلگتی ہے اور یادِ جاناں سے دل جو بے قرار ہوتا ہے

اس کے نتیجے میں یہ ترک تعلق برقرار نہیں رہتا اور ہم اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر محبوب سے دوبارہ تعلق قائم کر لیتے ہیں۔

شعر نمبر 2

ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم
منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بے کسی سے ہم

منہ دیکھنا = حیرانی سے دیکھنا۔ حسرت سے تکنا

بے کسی = عاجزی۔ لاچاری

یہاں مومن نے کنایے اور اشارے میں محبوب اور غیر کے تعلق پر روشنی ڈالی ہے اور اپنی حرماں نصیبی کا ذکر کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب ہم اپنے محبوب کو رقیب کے ساتھ ہنس ہنس کر بات کرتے ہوا دیکھتے ہیں تو ہمیں اپنی بے چارگی کا شدت سے احساس ہوتا ہے اور اپنی بدنصیبی پر رونا آتا ہے۔ بار بار یہ احساس جاگزیں ہوتا ہے کہ ہم تو اس کی محبت میں گرفتار ہیں۔ اس سے بے لوث الفت کرتے ہیں لیکن ہمارے نصیب میں سوائے محرومی کے کچھ نہیں۔ محبوب غیروں کے ساتھ تو ہنس ہنس کر باتیں کرتا ہے لیکن ہم سے سراسر بے التفاتی رتا ہے۔

شعر نمبر 3

ہم سے نہ بولو تم اسے کیا کہتے ہیں بھلا
انصاف کیجیے پوچھتے ہیں آپ ہی سے ہم

مومن کا یہ شعر مکالمے کی ایک عمدہ مثال ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا محبوب بلاوجہ ہم سے روٹھ گیا ہے اور اب بات تک کرنا گوارا نہیں کرتا۔ اس کی خفگی کو دیکھتے ہوئے مومن محبوب سے نہایت لطیف پیرائے میں شکایت کرتے ہیں کہ تم جو ہم سے بات چیت نہیں کر رہے ہو اور روٹھے ہوئے ہو اس طور طریقے اور انداز کو بھلا کیا کہتے ہیں تم ذرا انصاف تو کرو کہ تمھارے اس رویے سے عاشق کے دل پر کیا گزرے گی۔ اس کا جینا حرام ہو جائے گا۔ لہٰذا ہم تم سے ہی انصاف کے طلب گار ہیں۔

شعر نمبر 4

اس کو میں جا مریں گے مدد اے ہجومِ شوق
آج اور زور کرتے ہیں بے طاقتی سے ہم

کُو = گلی کوچہ

بے طاقتی = کمزوری۔ ضعیف

ہجوم شوق = بے پناہ جذبہ

شاعر کی خواہش ہے کہ وہ محبوب کی گلی میں جا کر اپنی جان دے دے۔ لیکن کمزوری اس درجہ لاحق ہے کہ اس سے

اٹھانہیں جا رہا ہے۔ چنانچہ اپنے شوق بے پایاں کو آواز دیتا ہے کہ وہ سہارا دے اور اس کی مدد کرے تا کہ اس بے طاقتی کے عالم میں بھی کوچۂ محبوب تک پہنچنا ممکن ہو جائے۔

مومن یہاں ایک بڑا اہم نکتہ پیش کر رہے ہیں۔ وہ یہ کہ انسان لاکھ بے بس ہو، لیکن اگر شوق اور جذبہ کارفرما ہو تو منزلِ مقصود تک پہنچ جانا کوئی مشکل امر نہیں! ہر پُرکٹھن راہ طے ہو جاتی ہے اور راستے کی تمام دشواریاں کافور ہو جاتی ہیں۔ ہاں، جذبہ صادق ضروری ہے۔

شعر نمبر 5

ان ناتوانیوں پہ بھی تھے خارِ راہِ غیر
کیوں کر نکالے جاتے نہ اس کی گلی سے ہم

خارِ راہِ غیر = محبوب کے راستے کا کانٹا

محبوب کو ہمارا وجود کسی صورت بھی گوارا نہیں۔ وہ ہمیں دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ اب یہ دیکھئے کہ نہایت ناتوانی کے عالم میں اس کے گھر کے راستے پر پڑے ہیں۔ کوئی سکت نہیں، کوئی تاب و طاقت نہیں۔ کچھ لے کر گزرنے کی صلاحیت نہیں۔ اس کے باوجود اس کے راستے کا کانٹا بنے ہوئے ہیں چنانچہ اس کی گلی سے اٹھوا کر پھینک دیئے گئے۔

3.4 غزل نمبر 4

ناوک انداز جدھر دیدۂ جاناں ہوں گے
نیم بسمل گئی ہوں گے کئی بے جاں ہوں گے
تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے
ہم تو کل خواب عدم میں شب ہجراں ہوں گے
چاک پردے سے یہ غمزے ہیں تو اے پردہ نشیں
ایک میں کیا سبھی چاک گریباں ہوں گے
پھر بہار آئی وہی دشت نوردی ہوگی
پھر وہی پاؤں وہی خار مغیلاں ہوں گے
عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومنؔ
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

تشریح

شعر نمبر 1

ناوک انداز جدھر دیدۂ جاناں ہوں گے
نیم بسمل کئی ہوں گے کئی بے جاں ہوں گے

ناوک انداز = تیر انداز

دیدۂ جاناں = محبوب کی آنکھ

نیم بسمل = آدھا ذبح کیا ہوا۔ مجروح۔ گھائل۔ ادھ موا

یہ مومن کی نہایت مشہور غزل ہے اور اس کی بحر نہایت مترنم ہے۔ مطلع میں کہتے ہیں کہ محبوب آنکھ اٹھا کر جس طرف دیکھے گا ادھر اس کی نگاہوں کے تیر سے بعض عشاق تو مجروح ہوں گے اور کچھ مر جائیں گے۔ یہاں محبوب کی آنکھ کی جلوہ پاشیوں اور اس کے اثرات کو واضح کیا جا رہا ہے۔ شعرائے اردو نے یوں تو محبوب کی چشم فسوں ساز کی خوبیاں مختلف انداز میں بیان کی ہیں لیکن جو انفرادی پہلو مومن کے اس مطلع میں ہے، اس کی مثال کہیں اور مشکل سے ملے گی۔

شعر نمبر 2

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے
ہم تو کل خواب عدم میں شب ہجراں ہوں گے

ٹھکانا کرنا = کسی جگہ رہنے اور ٹھہرنے کا انتظام کرنا

خواب عدم = ابدی نیند۔ موت کی نیند

شب ہجراں = جدائی کی رات

مومن نے اس شعر میں انوکھا مضمون باندھا ہے۔ وہ فرقت کی رات سے ہمکلام ہو کر یہ کہتے ہیں کہ زندگی بھر تو تو نے مجھے مضطرب و پریشان رکھا۔ تیری وجہ سے میں نیند سے محروم رہا۔ میری موت کا وقت آ گیا ہے۔ میں ابدی نیند سونے والا ہوں فکر ہے تو تیری ہے میں جب تک جیتا رہا، تو میرے پلے بندھی رہی۔ اب تیرا کیا حشر ہوگا۔ بہتر ہے کہ تو رہنے کے لیے اور جگہ ڈھونڈ لے۔ بادی النظر میں وہ یہ باور کرا رہے ہیں کہ جب تک زندہ ہے، یہ سارے جھمیلے ہیں۔ ادھر آنکھ بند ہوئی، سارے علائق دینوی ختم ہو گئے۔

شعر نمبر 3

چاک پردے سے یہ غمزے ہیں تو اے پردہ نشیں
ایک میں کیا سبھی چاک گریباں ہوں گے

چاک = شگاف۔ پھٹا ہوا۔ دریدہ

چاک گریباں = پھٹا ہوا۔ دامن

شاعر محبوب سے مخاطب ہے اور اسے پردہ نشیں کے لقب سے نواز رہا ہے۔ کہتا ہے کہ اے میرے پردہ نشیں محبوب تو پردے کے شگاف سے جو اس طرح غمزدہ ادا کا مظاہرہ کر رہا ہے تیو اس کے نتیجے میں میرے ساتھ ساتھ سب ہی سودائی ہو جائیں گے اور عالم جنوں میں اپنے دامن کو تار تار کر دیں گے۔ تیرے پردے کا ایک چاک سینکڑوں چاک کا سبب بن جائے گا۔ اس لیے تیرا عرفے سے اس طرح جھانکنا اور عشق طرازی کرنا مناسب نہیں۔

شعر نمبر 4

پھر بہار آئی وہی دشت نوردی ہوگی
پھر وہی پاؤں وہی خار مغیلاں ہوں گے

دشت نوردی = جنگلوں میں پھرنا۔ در بدر پھرنا

خار مغیلاں = کیکر کا کانٹا۔ دل کا کانٹا

مومن کہہ رہے ہیں کہ بہار کا زمانہ پھر آ گیا ہے۔ جنونِ عشق پھر فزوں ہوگا اور اس عالم میں جنگلوں اور بیابانوں میں پھرنا میرا مقدر ٹھہرے گا۔ پاؤں ننگے ہوں گے جن میں ببول کے کانٹے چبھتے رہیں گے۔ خون رستا رہے گا اور یہ آبلہ پائی ناکامی عشق کے نتیجے میں ہوگی۔ گویا عاشق کے لیے بہار کا زمانہ بھی کلفتوں کا زمانہ ہے۔

شعر نمبر 5

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومؔن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

بتاں = معشوق

مومن اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہہ رہے ہیں کہ اپنی ساری زندگی پری چہرہ لوگوں اور حسین و جمیل بتوں کے عشق میں گزر گئی اب جو آخری وقت آیا ہے تو اس میں کیا خاک مسلماں ہوں گے یعنی موت کے وقت بھی یاد جاناں ذہن و دل پر مسلط رہے گی۔

بتاں، مومن اور مسلمان میں رعایت پائی جاتی ہے۔ مومن نے اپنے مقطعوں میں اپنے تخلص سے خاص کام لیا ہے۔

3.5 غزل نمبر 5

صبر وحشت اثر نہ ہو جائے
کہیں صحرا بھی گھر نہ ہو جائے

رشک پیغام ہے عناں کش دل
نامہ بر، راہ بر نہ ہو جائے
دیکھ! مت دیکھیو کہ آئینہ
غش تمھیں دیکھ کر نہ ہو جائے
عشق پردہ نشیں میں مرتے ہیں
زندگی پردہ در نہ ہو جائے
مومن ایماں قبول دل سے مجھے
وہ بت، آزردہ گر نہ ہو جائے

تشریح

شعرنمبر1

صبر وحشت اثر نہ ہو جائے
کہیں صحرا بھی گھر نہ ہو جائے

وحشت اثر=جنوں کے زیراثر۔وحشت زدہ

شاعر کہتا ہے کہ عاشق نے محبت میں صبر کا دامن چھوڑ دیا اور اس کا دل جب گھر میں نہ لگا تو جنگل کی طرف نکل گیا۔ وہاں پہنچنے پر اس کو خیال آیا کہ وہ صبر کو گھر میں چھوڑ کر آ گیا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ گھر کی وحشت کا صبر پر بھی اثر ہو اور صبر بھی جنگل کا رخ کرے۔ پھر گھر اور صحرا میں کیا فرق رہ جائے گا۔ مومن نے اس شعر، میں ایک اچھوتا خیال پیش کیا ہے۔

شعرنمبر2

رشک پیغام ہے عناں کش دل
نامہ بر، راہ بر نہ ہو جائے

عناں=لگام

شاعر نے اپنے محبوب کو نامہ بر کے ذریعے پیغام تو بھیجا ہے، لیکن اس کو اس خیال سے رشک آیا کہ نامہ بر تو در محبوب تک پہنچ جائے گا۔ لہٰذا اس جذبہ رشک کی وجہ سے وہ بھی نامہ بر کے ساتھ ساتھ جانے کا ارادہ کر رہا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے کہ میرے دل کو کھینچ رہا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ نامہ بر آگے آگے ہو اور میں اس کے تعاقب میں روانہ ہو جاؤں۔

شعرنمبر3

دیکھ! مت دیکھیو کہ آئینہ
غش تمھیں دیکھ کر نہ ہو جائے

غش ہونا = بے ہوش ہونا۔ فریفتہ ہونا۔ عاشق ہونا

یہ شعر مومن کی نازک خیالی کی عمدہ مثال ہے۔ نہایت لطیف مضمون پر مبنی اس شعر میں شاعر محبوب کو تاکید کرتا ہے کہ وہ ہرگز آئینہ نہ دیکھے۔ کیونکہ محبوب اتنا حسین وجمیل اور خوب صورت ہے کہ اگر آئینہ اس کو دیکھے گا تو وہ بھی فریفتہ ہو جائے گا اور اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھے گا۔

شعر نمبر 4

عشق پردہ نشیں میں مرتے ہیں
زندگی پردہ در نہ ہو جائے

پردہ نشیں = باعصمت۔ پاک دامن

پردہ در = چغل خور۔ عیب ظاہر کرنے والا

مومن کا محبوب پردہ نشیں ہے، چونکہ وہ پاک دامن ہے اور پردہ میں رہتا ہے اس لیے مومن اس سے مل نہیں سکتے اور انھیں ہجر کے صدمات برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ شاعر وحشت اثر ہو جائے گا اور اس پر جنونی کیفیت طاری ہو جائے گی۔ اس طرح اس کی زندگی اس کے محبوب کی پردہ داری کر دے گی یا اس کی محبت کا راز افشا کر دے گا۔

شعر نمبر 5

مومن ایماں قبول دل سے مجھے
وہ بت، آزردہ گر نہ ہو جائے

بت = محبوب

آزردہ = رنجیدہ۔ خفا

مومن کہتے ہیں کہ میں صدق دل سے ایمان قبول کرنے کو تیار ہوں، لیکن شرط یہ ہے کہ محبوب خفا نہ ہو۔ بات دراصل یہ ہے کہ ایمان قبول کرنا عشق ومحبت سے توبہ کرنا ہے اور یہ بات بھلا محبوب کس طرح گوارا کر سکتا ہے کہ اس سے محبت کرنا چھوڑ دی جائے۔ اس طرح تو اس کی شان محبوبیت میں فرق پڑ جائے گا۔

4۔ خودآزمائی

1۔ حکیم مومن خان مومن غزل گوشعرا میں ایک ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ بحث کیجیے۔

2۔ غزلیات مومن کی خصوصیات بیان کیجیے اور مثال میں ان کے اشعار پیش کیجیے۔

3۔ نیاز فتح پوری کی اس رائے سے آپ کہاں تک اتفاق کرتے ہیں کہ:

''مومن ہی ایک ایسا شاعر ہے جو نفسیاتی رموز کو سمجھ شاعری کرتا ہے'' مدلل جواب دیجیے۔

4۔ مندرجہ ذیل اشعار کی تشریح کیجیے۔

دشنامِ یار طبعِ حزیں پر گراں نہیں
اے ہم نفس ! نزاکت آواز دیکھنا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

6۔ مجوزہ کتب برائے مطالعہ

1۔ دیوان مومن، مرتبہ: ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، ادارہ صبح ادب، اردو بازار، دلی، 1971ء

2۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، مومن اور مطالعہ مومن، اردو دنیا، کراچی، 1961ء

3۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، ولی سے اقبال تک:، چمن بک ڈپو، نئی دلی، 1985ء

4۔ ڈاکٹر جمیل جالبی تاریخ ادب اردو:، جلد چہارم، مجلس ترقی ادب، لاہور، 2006ء

5۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی ولی کا دبستان شاعری، اتر پردیش اکادمی، لکھنو، 1997ء

6۔ غالب نامہ، (مدیر) پروفیسر نذیر احمد، مومن خان مومن نمبر، غالب انسٹی ٹیوٹ دلی، 1985ء

7۔ مومن خان مومن، حیات وشاعری، مرتبہ پروفیسر نذیر احمد، غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دلی، 1991ء

یونٹ نمبر 6

غزلیاتِ حالؔی

تحریر: ڈاکٹر محمود الرحمٰن
نظرِ ثانی: پروفیسر ڈاکٹر محمد کامران

فہرست

یونٹ کا تعارف

عزیز طلبہ وطالبات!

اس یونٹ میں آپ الطاف حسین حالی کے حالاتِ زندگی ،فکری ارتقا اور غزلیات کا مطالعہ کریں گے۔مولوی الطاف حسین حالی اردو کے بلند پایہ شاعر تھے۔ وہ شاعری کی جدید تحریک کے سب سے بڑے حامی اور موئید تھے۔ جدید شاعری کے خیال، اس کے اصول اور اس کی ضرورت کو مقبول بنانے کی کوشش میں وہ پیش پیش تھے۔ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے شاعری میں کامیاب انقلابی تجربے کیے۔اسے مبالغے اور غلو سے پاک کر کے اصلیت اور حقیقت سے روشناس کیا۔حالی نے قدیم رنگ میں بھی غزلیں کہی ہیں اور جدید طرز میں بلکہ یوں کہیے کہ جدید غزل کا تصور حالی کے تغزل کا ہی مرہون منت ہے۔ان ہی کے ہاتھوں یہ پروان چڑھی۔آج اردو غزل گوئی جس مقام پر فائز ہے، وہ دراصل حالی کی کوشش کا ہی نتیجہ ہے اس دور میں بھی شعرائے غزل حالی کو اپنا پیشوا تصور کرتے ہیں۔اس کی وجہ خود مولانا حالی کا یہ اعلان ہے:

سلف لکھ گئے جو قیاس و گماں سے
صحیفے ہیں اترے ہوئے آسماں سے

یونٹ کے مقاصد

امید ہے کہ اس یونٹ کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہوسکیں گے کہ

۱۔ ایک غزل گو شاعر کی حیثیت سے حالی کی عظمت اور مقبولیت کو بیان کر سکیں۔
۲۔ اردو کے غزل گو شاعروں میں حالی کے مقام اور مرتبے کا تعین کر سکیں۔
۳۔ غزل میں حالی کے قدیم و جدید رنگ میں امتیاز کر سکیں
۴۔ اس یونٹ میں شامل غزلیات حالی کا مطالعہ کر کے ان کی تشریح کر سکیں۔

1۔ مولانا الطاف حسین حالی

(1837ء۔1914ء)

1.1 سوانح

الطاف حسین نام اور حالی تخلص۔ ولادت 1837ء میں پانی پت میں ہوئی۔ ان کے مورث اعلیٰ شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری ''پیر ہرات'' کہلاتے تھے۔ انھی کی اولاد میں ایک بزرگ خواجہ ملک علی بادشاہ بلبن کے عہد یعنی تیرہویں صدی عیسوی میں ہرات سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے۔ بلبن نے از راہ قدردانی انھیں پانی پت کی جاگیر عطا کر دی۔ مذکورہ شہر میں انصاریوں کا محلّہ انھی بزرگ کی اولاد سے آباد ہے۔

حالی کی ولادت کے بعد ان کی والدہ کو خلل دماغ کا عارضہ ہو گیا۔ پھر ان کے والد وفات پا گئے۔ اس وقت حالی کی عمر صرف نو سال تھی۔ چنانچہ بھائی بہن نے ان کی سرپرستی کی۔ حالی نے پہلے قرآن حفظ کیا۔ بعد ازاں، مختلف استادوں سے فارسی، تاریخ طب اور عربی کی کتابیں پڑھیں۔

ابھی وہ سترہ برس کے بھی نہیں تھے کہ خاندان والوں نے انھیں مجبور کر کے شادی کر دی۔ چونکہ بیوی کے والدین خوش حال تھے اس لیے اس طرف سے زائد فکر نہ تھی۔ پھر ان کا تعلیمی سلسلہ بھی منقطع ہو گیا تھا۔ چنانچہ علم کا شوق انھیں دہلی لے گیا۔ تقریباً ڈیڑھ برس تک وہاں رہ کر حالی نے صرف و نحو اور منطق کی کتابیں پڑھیں اور زمانے کے موافق عربی و فارسی کا درس بھی لیا۔ بعد ازاں، عزیزوں کے پیہم اصرار کی وجہ سے دہلی سے پانی پت آ گئے اور اپنے طور پر کتب بینی کرتے رہے۔

1856ء میں حالی کو ضلع حصار کی کلکٹری میں ایک معمولی ملازمت مل گئی۔ لیکن اگلے ہی سال آزادی کی جنگ چھڑ گئی اور حالی پھر اپنے وطن واپس آ گئے۔ اس مرتبہ یہیں کے مختلف علما سے فلسفہ، حدیث اور تفسیر پڑھتے رہے۔ اس کے چار سال بعد پھر دہلی آئے۔ یہاں نواب مصطفیٰ خان شیفتہ سے ان کا تعارف ہوا۔ وہ انھیں اپنے ساتھ جہانگیر آباد لے گئے اور اپنے لڑکوں کا اتالیق مقرر کیا۔ حالی نے تقریباً آٹھ سال نواب صاحب کی صحبت میں گزارے۔

نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کی وفات کے بعد حالی پھر تلاش معاش میں سرگرداں ہوئے اور لاہور پہنچے۔ یہاں انھیں پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں ملازمت مل گئی۔ بک ڈپو میں جو ترجمے انگریزی سے اردو میں ہوتے تھے ان کی عبارت درست کرنے کا کام حالی کے سپرد تھا۔ تقریباً چار سال تک حالی نے یہ فریضہ انجام دیا اور اس طرح مغربی زبان اور ادب کے خیالات سے ان کو بالواسطہ مناسبت پیدا ہو گئی۔ اسی زمانے میں انجمن پنجاب قائم ہوئی۔ وہ مولانا محمد حسین آزاد کے ساتھ اس کے مشاعروں میں شریک ہوئے اور جدید طرز کی نظمیں لکھ کر سنائیں۔

لاہور میں چار سال کا عرصہ گزارنے کے بعد حالی دلی آئے۔ یہیں سرسید سے ملاقات ہوئی جن کے ایما سے حالی نے ''مدوجزر اسلام''، جیسی شہرہ آفاق نظم لکھی۔ اپنے آبائی وطن میں زندگی کا آخری دور تصنیف و تالیف کا کام کرنے میں گزارا اور یہیں 1914ء میں وفات پائی۔

1.2 قدیم وجدید رنگ اور محاسن کلام

حالی نے جب آنکھ کھولی تو غزل کا دور دورہ تھا۔ غالب اور شیفتہ جیسی باکمال شخصیتوں کا طوطی بول رہا تھا۔ حالی نے نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کی صحبت میں آٹھ سال گزارے۔ نواب صاحب اردو اور فارسی کے شاعر اور نقاد تھے۔ مرزا غالب نے بھی ان کی سخن فہمی اور سخن شناسی کا اعتراف کیا ہے۔ حالی کو نواب شیفتہ کی صحبت سے بڑا فائدہ ہوا۔ شیفتہ مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرتے اور سیدھی سادی باتوں کو حسن بیان سے دلچسپ بنا دیتے تھے۔ حالی نے شاعری کا یہ گر ان ہی سے سیکھا۔ پھر غالب کی صحبت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔

مولانا حالی کی شاعری کی ابتدا غزل سے ہوئی۔ ان کی ابتدائی غزلوں ل میں غالب اور شیفتہ کا رنگ پایا جاتا ہے نومشقی کے زمانے کی کہی ہوئی غزلوں میں دہلوی اسکول کی امتیازی شان موجود ہے۔ حسن وعشق کے معاملات وجذبات جو تغزل کی جان ہیں وہ الطاف حسین حالی کی غزلوں میں پوری طرح موجود ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس نومشقی کے زمانے میں بھی زبان کی سادگی، روانی اور صفائی جس کو غالب اور شیفتہ کی تربیت نے مزید نکھارا تھا، حالی کے خوش آئند مستقبل کا پتہ دیتی ہیں۔

یہاں یہ بات واضح کر دی جائے کہ سرسید احمد خان سے ملنے کے بعد حالی شاعری میں اخلاقی اور اصلاحی موضوع نمایاں ہو گیا۔ یہ اصلاحی اور اخلاقی رنگ ان کی غزلوں میں بھی پوری طرح جھلکنے لگا۔ انھی وجوہات کی بنا پر ہم ان کی غزلوں کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں اول قدیم رنگ کی غزلیں، دوم جدید انداز کی غزلیں۔

حالی نے اپنی قدیم غزلوں میں کبھی ایسے اشعار نہیں لکھے جن میں عامیانہ مذاق نظر آتا ہو، جس کی بنیاد سطحی عشق اور ہوا و ہوس کے جذبات پر رکھی گئی ہو۔ انھوں نے اپنی غزلوں کی بنیاد صنائع و بدائع اور رعایت لفظی پر کبھی نہیں رکھی ان کے کلام میں معشوق کے جسمانی اوصاف کا تذکرہ بھی کھل کر نہیں ہوتا۔ ہجر و وصال قاصد و رقیب کے مضامین اگر ملتے بھی ہیں تو نہایت شستہ انداز میں۔ ان کی قدیم غزلوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ موضوع اور مضمون کسی بھی نوعیت کا ہو، ان کا انداز بیان شاعرانہ ہے۔ غرض حالی کی قدیم رنگ کی غزلیں مبالغہ اور تصنع سے پاک ہیں۔ ان میں تغزل کی شیرینی بھی ہے اور حقیقت و اصلیت کی چاشنی بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی قدیم رنگ کی غزلیں بے حد مقبول ہیں۔

حالی کی جدید غزلوں میں خیالات اور انداز بیان ناصحانہ ہیں۔ انھوں نے اپنی قوم کی اصلاح کے لیے غزل گوئی کا بھی سہارا لیا اور تغزل کے ذریعہ افراد کو جھنجھوڑنے کی کوشش بھی کی یا یوں کہیے کہ افراد قوم کو فرائض کا احساس دلایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی جدید غزلوں میں شاعرانہ حسن کی بجائے ناصحانہ انداز پایا جاتا ہے۔

غرض اس دور کی غزل میں حالی نے ''لامقصدیت'' بالکل ترک کر دی اور غزل کے لیے جب قلم اٹھایا، کسی اصلاحی جذبے، بے اخلاقی تاثر یا حالات حاضرہ کی تنقید و تشریح کی ضرورت کے پیش نظر اٹھایا۔ بادی النظر میں انھوں نے روایتی عشقیہ رنگ سے توبہ کر لی۔ چنانچہ آخری زمانے کی غزلوں میں اجتماعی زندگی کے مسائل سے متاثر ہو کر مضامین پیش کیے گئے ہیں۔

ہو چکے حالی غزل خوانی کے دن
راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا

اس تبدیلی کی نمایاں وجہ یہ تھی کہ مولانا الطاف حسین حالی زندگی، معاشرے اور کائنات کی جن وسعتوں کو اشعار میں سمونا چاہتے تھے۔ پھر غزل کی محدود فارم، اس صنف سخن کی نرگسیت اور ایاز و اختصار ان موضوعات کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے، اس کے لیے ایک مخصوص اور اعلیٰ فارمیٹ کی ضرورت تھی جو اس دور کی غزل گوئی میں عنقا تھی۔

1.3 دلی کا شاعرانہ ماحول اور شیفتہ کی سرپرستی

بہر حال، یہ بات مسلمہ ہے کہ حالی کی غزل گوئی پر مجموعی اعتبار سے دہلی کی داخلیت پسندی کا گہرا عکس تھا وہ جب پانی پت سے دلی آئے، تو جہاں آبادی تہذیب وتمدن کی شمعیں روشن تھیں۔ وہاں باکمال شاعروں کا مجمع تھا۔ حالی کا شعری مذاق اسی دہلوی ماحول کا پروردہ تھا۔ پھر وہ شیفتہ سے خاصے مستفید بھی ہوئے تھے۔ غرض، دلی کے شاعرانہ ماحول اور شیفتہ کی سرپرستی نے ان کی غزل گوئی کو نیا رنگ دیا۔ حالی کے دور اول کی غزلوں میں حسن بیان کی رنگینی اور سوز و گداز کا نم اسی دہلوی ماحول کا پیدا کردہ ہے۔ جمالیاتی شعور کی رو اور تغزل وترنم کی کیفیات ان کی غزلوں میں قدر مطلق بن کر نمایاں ہوئیں۔ نیز ان کی شاعری میں دردمندی، سپردگی اور خستگی کا احساس اجاگر ہوا۔ غرض وہ قلبی واردات کے شاعر بن گئے۔ اس ابتدائی دور کے اشعار حالی کے ان ہی رحجانات کے آئینہ دار ہیں۔

کیوں چھیڑتے ہو ذکر نہ ملنے کارات کے
پوچھیں گے ہم سبب تو بتایا نہ جائے گا
نہیں بھولتا اس کی رخصت کا وقت
وہ رو رو کے ملنا بلا ہو گیا
بے قراری تھی سب امید ملاقات کے ساتھ
اب وہ اگلی سی درازی شب ہجراں میں نہیں
ملتے ہی ان کو بھول گئیں کلفتیں تمام
گویا ہمارے سر پہ کبھی آسمان نہ تھا

1.4 اردو غزل میں عملیت پسندی

حالی کی غزلوں کا یہ مخصوص رنگ انقلاب ستاون سے پہلے کا تھا۔ جب زندگی کے جدید تقاضے ان کے سامنے آئے اور عقلیت کے شعاعیں ان کے ذہن کو منور کرنے لگیں تو اصل اصلاحی، تخلیقی اور تعمیری صلاحیتیں نمایاں ہو گئیں۔ انھوں نے انقلاب کے بعد کے مجموعی حالات کا اثر اپنے رنگ و جاں میں جذب کیا اور بتدریج ان کی غزلوں میں ایک نیا شعور نمایاں ہوا۔ مقصدیت اور واقعیت کے اثرات گہرے ہوتے چلے گئے۔ ان سب باتوں کے نتیجے میں غزلیات حالی میں سماجی

کرب واضمحلال اور تہذیبی شکست و ریخت کی تلخیاں ابھر آئیں۔ پھر، یاس ومحرومی اور فراق ووصال کے جذبات ان کی غزلوں میں زندگی کے حقائق بن کر نمودار ہونے لگے۔ یہاں سے ان کی غزلوں میں تہذیبی، سماجی اور ثقافتی شعور کی لہریں موجزن ہوتی ہیں اور ان کے کلام میں ارتعاشِ عمل کی جھنکار صاف سنائی دینے لگتی ہے:

یارانِ تیزگام نے محمل کو جالیا
ہم محوِ نالہ جرس کارواں رہے

حالی نشاطِ نغمہ و مئے ڈھونڈتے ہواب
آئے ہو وقتِ صبح رہے رات بھر کہاں

حالی کی غزل میں توازن کے حوالے سے فراق نے بہت عمدہ بات کی ہے:

''حالی کی قوتیں تنگنائے غزل تک محدود رہ ہی نہیں سکتی تھیں۔ وہ لطیف ترین عشقیہ شاعری کے ساتھ ساتھ وطن وملت کی شاعری کی صلاحیت لے کر پیدا ہوئے تھے......
حالی کی شخصیت اور حالی کی نظم ونثر سب کا عطر وست حالی کی غزلوں میں ہمیں ملے گا۔
حالی کا کلام بہت ہموار ہے۔اس کے خشک سے خشک شعر میں کچھ نہ کچھ ہوتا ہے۔......
[حالی کی] مجہولیت زدہ اردو غزل کو عملیت کی طرف لے جانے کی کوشش قابل توجہ ہے۔''

(اندازے، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ۱۹۵۶ء، ص۲۳۴/۲۴۲/۲۴۳)

آخر میں ہم یہ کہنا چاہیں گے کہ جس طرح انقلاب ستاون کے بعد گرمیٔ محفل کے سامان بدلے اور دیگر اصناف سخن نے جنم لیا، اسی طرح غزل نے بھی نئی دنیا میں قدم رکھا اور مولانا حالی کے ہاتھوں پروان چڑھی۔ حالی نے مروجہ خیالات کو از کار رفتہ سمجھ کر غزل میں نیا انداز فکر، نیا طرز سخن، نیا ماحول فطرت اور نیچرل شاعری سے رغبت کے آثار پیدا کیے۔انھوں نے غزل کے مزاج میں مصلحانہ ڈھنگ سے ایسی تبدیلیاں کر دیں اس کی مقبولیت کو صدیوں کے لیے محفوظ و مامون کر دیا۔

حالی اب آؤ پیروی مغربی کریں
اب اقتدائے مصحفی ومیر ہوچکی

2۔ اہم نکات

1۔ حالی نے غزل گوئی 1857ء کے انقلاب سے پہلے شروع کر دی تھی۔

2۔ ان کے تغزل پر دہلوی داخلیت پسندی کا گہری عکس تھا۔

3۔ شیفتہ کی صحبتوں نے ان میں یہ شعور پیدا کیا کہ سادگی، خلوص اور اصلیت ہی اچھی شاعری کے جوہر ہیں۔

4۔ حالی کے دوراول کی غزلوں میں حسن بیان کی رنگینی اور سوز و گداز، جمالیاتی شعور اور ترنم کی کیفیات نمایاں ہوئیں۔

5۔ انقلاب 57ء کے بعد جدید تقاضے ان کے سامنے آئے تو ان میں اصل اصلاحی اور تعمیری صلاحیتیں نمایاں ہو گئیں۔

6۔ حالی کی جدید غزلیات سے اردو غزل میں نئے رجحانات کی ابتدا ہوئی اور قدیم رنگ غزل ماند پڑ گیا۔

7۔ انھوں نے غزل کو محدود مضامین کی قید سے نکالا اور اس میں اخلاق، سیاسیات، تمدن وغیرہ کے بہت سے موضوعات داخل کیے۔

8۔ حالی جدید غزل گوئی کے اولین معماروں میں شمار ہوتے ہیں۔

3۔ تشریحات

3.1 غزل نمبر 1

پیش از ظہورِ عشق کسی کانشاں نہ تھا
تھا حسن میزبان ،کوئی مہماں نہ تھا
ملتے ہی ان کے بھول گئیں کلفتیں تمام
گویاہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا
رونا ہے یہ کہ آپ بھی ہنستے تھے ورنہ یاں
طعنِ رقیب دل پہ کچھ ایسا گراں نہ تھا
تھا کچھ نہ کچھ کہ پھانس سی اک دل میں چبھ گئی
مانا کہ اس کے ہاتھ میں تیروسناں نہ تھا
بزم سخن میں جی نہ لگا اپنا زینہار
شب انجمن میں حالی جادو بیاں نہ تھا

تشریح

شعر نمبر 1

پیش ازظہورِعشق کسی کانشاں نہ تھا
تھاحسن میزبان،کوئی مہماں نہ تھا

پیش از = اس سے قبل

ظہور = ظاہر ہونا۔ابتدا۔شروع

حالی نے غزل کے اس مطلع میں عشق کے حوالے سے نہایت اہم بات کہی ہے اور متصوفانہ اندازفکر کواجاگر کیا ہے جب تک عشق اس دنیا میں ظاہر نہیں ہوا تھا حسن کی کوئی اہمیت نہ تھی۔اس کی حیثیت ایک میزبان کی تھی جسے کوئی مہمان میسر نہ تھا۔عشق کی بدولت ہی حسن کی پذیرائی ہوئی اور اس کے غمزہ عشوہٗ وادا کا چرچا عام ہوا۔بادی النظر میں وہ یہ کہنا چا رہے ہیں کہ یہ دنیا حسن کی مانند ہے۔اس کی خوب صورتی کا احساس ایسے عاشق کو ہوا جو انسان ہے اسی نے قدر و منزلت کی نظر سے حسن کائنات کامشاہدہ کیااور اسے وقعت بخشی۔حالی نے اس مطلع میں فلسفہ تصوف کاایک نکتہ تغزل میں ڈوبے ہوئے انداز سے بیان کیا ہے:

شعر نمبر 2

ملتے ہی ان کے بھول گئیں سب کلفتیں
گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

کلفت = زحمت۔تکلف۔اذیت

آسماں = کنایہ ہے مصائب و آلام کا مرکز

سب سے پہلے یہ بات سمجھ لی جائے کہ دنیا کے تمام ادب میں آسمان کو بلائے ناگہانی کا سبب قرار دیا گیا۔آسماں اور گردش آسمان ہی کو انسان کے حالات کے دگرگوں ہونے کا سبب قرار دیا جاتا ہے اس کنایہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے شعر کے مطلب پر غور کیجیے تو بات یہ ظاہر ہوتی ہے کہ محبوب کی جدائی میں دن نہایت کرب والم میں گزرے۔کسی آن سکون نہیں ملا۔ایسا لگتا تھا کہ بلائے آسمانی نازل ہوگئی ہے لیکن جب محبوب سے ملاقات ہوگئی اور اس کا وصال نصب ہو تو ساری اذیتیں یکلخت کافور ہو گئیں۔معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ ہمارے سر پر کبھی وہ آسمان بھی تھا جہاں سے بلاؤں کا نزول ہوتا رہا یعنی معشوق سے مل کر ماضی کی تلخیاں اور اذیتیں باقی نہیں رہیں واضح رہے کہ ''بھول گئیں کلفتیں تمام'' کو اس حالت سے تعبیر کرنا کہ گویا ہمارے سر پر آسماں نہ تھا، حالی کے مخصوص انداز تغزل کی نہایت اعلیٰ مثال ہے۔

شعر نمبر 3

رونا ہے یہ کہ آپ بھی ہنستے تھے ورنہ یاں
طعنِ رقیب دل پہ کچھ ایسا گراں نہ تھا

طعن = طعنہ۔ملامت

شاعر محبوب سے مخاطب ہو کر یہ کہہ رہا ہے کہ رقیب نے جب مجھ پر لعن طعن کیا اور بدکلامی کی تو میں نے اپنے دل پر اس کی باتوں کا چنداں اثر نہیں کیا اور دشنام طرازی کو برداشت کر گیا۔لیکن مجھے افسوس اس بات پر ہے کہ رقیب جب مجھے لعن طعن کر رہا تھا تو آپ ہنس رہے تھے، اس کی انداز سے خوش ہو رہے تھے آپ کے اس طرز تبسم سے میرے دل کو سخت اذیت پہنچی ہے۔بادی النظر میں شاعر یہ کہنا چاہ رہا ہے کہ کم از کم معشوق کو تو اس سے ہمدردی برتنی چاہیے تھی۔

شعر نمبر 4

تھا کچھ نہ کچھ کہ پھانس سی اک دل میں چبھ گئی
مانا کہ اس کے ہاتھ میں تیر وسناں نہ تھا

پھانس = تنکا۔خلش۔تکلیف

سناں = بھالا۔ نیزہ۔ برچھی

شاعر کہتا ہے کہ اگر چہ محبوب کے ہاتھ میں تیر و سناں قسم کا کوئی ہتھیار نہ تھا کہ جس سے وہ حملہ کر کے مجھے اذیت دیتا، اس کے باوجود اس کے رویے میں کچھ ایسی بات ضرور تھی کہ اس نے میرے دل میں کانٹا چبھو دیا۔ شاعر دراصل محبوب کے حسن و جمال کی اثر آفرینی ظاہر کر رہا ہے جس کے نتیجے میں اس کا دل گھائل ہو چکا ہے اور اسے ویسی ہی اذیت اور تکلیف پہنچ رہی ہے جو تیر و سناں کا زخم کھانے کے بعد پہنچتی ہے۔ گویا محبوب ایک ایسا شکاری ہے جو تیر و سناں کے بغیر ہی عاشقوں کا شکار کر لیتا ہے۔

شعر نمبر 5

بزم سخن میں جی نہ لگا اپنا زینہار
شب انجمن میں حالی جادو بیاں نہ تھا

زینہار = ہرگز نہیں۔ کبھی نہیں

جادو بیاں = جس کے کلام میں تاثیر ہو

شاعر کہتا ہے کہ رات میں بزم سخنوراں میں جانے کو تو چلا گیا مگر وہاں کوئی لذت نہیں ملی اور قطعاً دل نہیں لگا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مذکورہ محفل میں حالی جیسا سحر البیان شاعر موجود نہ تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں بزم شعرا سونی سونی محسوس ہوتی رہی۔ کسی نے مجھے اپنے کلام سے متاثر نہیں کیا ہاں اگر حالی جیسا فصیح البیان شاعر ہوتو یقیناً انجمن بارونق ہو جاتی۔ بادی النظر میں حالی اپنے کلام کی اثر آفرینی کا اظہار کر رہے ہیں، خصوصاً قدروں کے اس طنزیہ جملے کے پیش نظر کہ ''ان کی شاعری ابالی ہوئی کھچڑی کی مانند ہے'' جو بے مزا ہوتی ہے۔

3.2 غزل نمبر 2

اس کے جاتے ہی یہ کیا ہوگئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت
کس سے پیمان وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گل تر کی صورت
اپنی جیبوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار
اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت
واعظو! آتش دوزخ سے جہاں کو تم نے
یہ ڈرایا ہے کہ خود بن گئے ڈر کی صورت

ان کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

تشریح

اس کے جاتے ہی یہ کیا ہوگئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

شاعر کہتا ہے کہ محبوب کے جانے کے بعد عاشق کا گھر سونا سونا اور ماحول اداس اداس سا لگ رہا ہے۔اس کی آمد سے جو رونق اور چہل پہل تھی وہ مفقود ہوگی۔فضا بدل کر رہ گئی۔حتیٰ کہ دیوار و در کی صورت بھی بدلی بدلی نظر آ رہی ہے۔

حالی نے اس شعر میں انسان کی نفسیاتی کیفیت بیان کی ہے۔یعنی محبوب کے رخصت ہو جانے کے بعد اس کا دل جب اداس اور مغموم ہو تو یہ کیفیت گھر کی ساری فضا پر محیط نظر آتی ہے۔چنانچہ دیوار بھی بدل گئی ہے اور در کی صورت بھی تبدیل ہوگئی ہے مادی لحاظ سے دونوں اپنی جگہ موجود ہیں مگر شاعر کے احساس کے زیر اثر سب کچھ بدل گیا ہے۔

شعر نمبر 2

کس سے پیمان وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گل تر کی صورت

پیمان وفا = وفاداری کا عہد

گل تر = تر و تازہ پھول

حالی کا یہ شعر نہایت حکیمانہ ہے۔وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ دنیا کی ہر چیز ناپائیدار ہے،خواہ وہ زندگی ہو،گل تر ہو،حسن محبوب ہو،رنگینیٔ بہار ہو۔آج بلبل پھول کو دیکھ کر لوٹ پوٹ ہو رہی ہے اور اس سے پیمان وفا باندھ رہی ہے اس سے زندگی بھر محبت کرنے کا عہد کر رہی ہے،لیکن کل یہی تر و تازہ اور حسین پھول جب مرجھا جائے گا تو پہچانا بھی نہ جا سکے گا۔

گل و بلبل کے کنائے میں حالی نے خود انسان کی بے ثباتی کا نقشہ کھینچا ہے۔عاشق صادق محبوب کے حسن و جمال پر فریفتہ ہو جائے،مگر کل یہی دل ربا،سرو قد اور مہ وش معشوق اضمحلال و پژمردگی کا پیکر بن جاتا ہے غرض زندگی کی نہایت تلخ حقیقت کو دلکش پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔

یونٹ نمبر 3

اپنی جیبوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار
اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت

خضر = ایک پیغمبر اور بعض روایات کے مطابق ایک جلیل القدر بزرگ جن کے بارے میں مشہور ہے کہ انھوں نے آب حیات

پیا ہے اور وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے وہ بھولے بھٹکوں کی رہنمائی کرتے ہیں کنایۃ رہبر رہنما۔ کسی بزرگ کو خضر سے مشابہ قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ خضر کی طرح نہایت بوڑھے اور سفید ہوں گے۔

حالی نے اس شعر میں اصلیت ظاہر کی ہے۔ وہ دیکھنے میں کچھ ہوتا ہے اور فطری لحاظ سے کچھ اور مثلاً ایک شخص نہایت دیندار اور بزرگ دکھائی دیتا ہے لیکن وہ اس کے برعکس ریا کار اور چوراچکا بھی ہوسکتا ہے۔ چنانچہ حالی نمازیوں کو ایسے ہی ریا کاروں سے ہوشیار کرتے ہیں اور انھیں اپنی جیبوں کے بارے میں محتاط اور چوکس رہنے کی تلقین بھی کرتے ہیں کہ مبادا نماز کی حالت میں وہ ریا کار بزرگ ہاتھ کی صفائی دکھا جائیں۔

یونٹ نمبر 4

واعظو! آتش دوزخ سے جہاں کو تم نے
یہ ڈرایا ہے کہ خود بن گئے ڈر کی صورت

واعظو = واعظ کی جمع

آتش دوزخ = جہنم کی آگ

یہ ڈرایا ہے = اس قدر ڈرایا ہے

پہلے یہ بات ذہن نشین کر لی جائے کہ واعظ انسانوں کے غلطیوں اور خطاؤں پر سرزنش کرتا ہے اور انھیں یہ کہہ کر ڈراتا رہتا ہے کہ اگر وہ گناہوں سے باز نہ آئے تو مرنے کے بعد دوزخ میں ڈال دیئے جائیں گے۔ وہاں کی آگ ان کو بھسم کرتی رہے گی۔ اگر چہ واعظوں کا مقصد گناہ گاروں کی اصلاح کرنا ہے، لیکن سننے والوں پر خوف ودہشت کی کیفیت ظاہر ہوجاتی ہے۔ چنانچہ حالی ایسے واعظوں سے مخاطب ہوکر کہہ رہے ہیں کہ تم لوگوں نے انسانوں کو دوزخ کی آگ سے اس قدر ڈرایا ہے کہ وہ دوزخ سے ڈرنے کی بجائے تم سے ڈرنے لگے ہیں انھیں نفسیاتی طور پر تم سے خوف آنے لگا ہے۔ گویا اس طرح تم واعظوں نے عوام الناس کے ذہن ودل پر دہشت طاری کر دی ہے۔

شعر نمبر 5

ان کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

ان کو = یہاں محبوب مراد ہے

اس مقطع میں حالی نے اپنی ذات کی کم مائیگی اور بے وقعتی ظاہر کی ہے۔ وہ کہناہ چاررہے ہیں کہ اس محبوب کو جس کی ایک دنیا دیوانی ہے۔ حالی بھی اپنے گھر مدعو کرررہے ہیں۔ یہ بات خاصی حیرت زدہ ہے وہ نہ اپنی شکل وصورت کے لحاظ سے اس قابل ہیں کہ محبوب جیسے پری پیکر کو اپنے پاس بلائیں اور نہ ان کا گھر ہی اس لائق ہے کہ ایسی باوقار شخصیت کو وہاں بلایا جائے۔ گویا حالی نے اپنی ذات کو نہایت حقیر اور بے وقعت انسان کے طور پر پیش کیا ہے اور یہ بات شاعر کی کسر نفسی کی علامت ہے۔

3.3 غزل نمبر 3

عالم آزاد گاں ہے اک جہاں سب سے الگ
ہے زمیں ان کی اور ان کا آسماں سب سے الگ
پاک ہیں آلائشوں میں، بندشوں می بے لگاؤ
رہتے ہیں دنیا میں سب کے درمیاں سب سے الگ
سب کی سن لیتے ہیں لیکن اپنی کچھ کہتے نہیں
ہے کوئی بھیدی اور ان کا راز داں سب سے الگ
شاعروں کے ہیں سب انداز سخن دیکھے ہوئے
دردمندوں کا ہے دکھڑا اور بیاں سب سے الگ
مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالی نے دکاں سب سے الگ

تشریح

شعر نمبر 1

عالم آزاد گاں ہے اک جہاں سب سے الگ
ہے زمیں ان کی اور ان کا آسماں سب سے الگ

آزادگان = آزاد کی جمع۔ معنی ہے شرفاء۔ آزاد

حالی نے جس دور میں یہ غزل لکھی تھی، وہ تہذیب واخلاق کی تباہی کا دور تھا۔ مغلیہ حکومت ختم ہو چکی تھی۔ برطانوی حکومت کی آمد کے ساتھ ہی نئے کلچر اور تمدن نے فروغ پا لیا تھا سبھی اس مغربی طوفان کی زد میں تھے، لیکن اس پر آشوب وقت میں کچھ شرفا ایسے بھی تھے جو علم واخلاق کی شمع تھامے سب سے الگ تھلگ زندگی گزار رہے تھے۔ ان کا انداز حیات، ان کی فکر، ان کی سوچ عام روش سے ہٹ کر تھی اور قدیم شرافت کا چراغ ان ہی کے دم سے روشن تھا۔ وہ مغربی تہذیب وتمدن کے سیلاب بلا سے اپنے آپ کو بچائے ہوئے تھے اور اسلاف کی اقدار وروایات کی بھر پور حفاظت کر رہے تھے۔ انقلاب 57ء کے بعد ایسی روش اختیار کرنا بڑے جان جوکھوں کا کام تھا، لیکن یہ آزاد طبع اپنی شرافت ونجابت کو بچائے ہوئے تھے۔

شعر نمبر 2

پاک ہیں آلائشوں میں، بندشوں میں بے لگاؤ
رہتے ہیں دنیا میں سب کے درمیاں سب سے الگ

آلائش = آلودگی۔ غلاظت۔ ملاوت

بندش = پابندی۔ روک تھام۔ قید

بے لگاؤ = غیر جانبدار۔ بے لاگ۔ بے تعصب

شاعر کہتا ہے کہ یہ لوگ دنیاوی آلودگی اور ہوا و ہوس کی علامت سے بالکل پاک ہیں ان میں ریا کاری اور مطلب پرستی بالکل نہیں۔ یہ لوگ کسی قسم کی بندش کو قبول نہیں کرتے۔ اپنی رائے اور فکر میں آزاد ہیں اور بے لاگ تبصرہ کیا کرتے ہیں۔ اگر چہ یہ شرفا اس دنیا کے باشندے ہیں، لیکن سب کے درمیان رہتے ہوئے بھی سب سے الگ تھلگ نظر آتے ہیں ان میں جو انفرادیت ہے اسے وہ ہر حال میں برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ نئی تہذیب اور نئی تعلیم سے یہ خود کو متاثر نہیں ہونے دیتے۔ مغرب کے سیلاب بلا خیز میں اپنی روایات و اقدار کو برقرار رکھنا ان بزرگوں کا ہی حوصلہ اور دم خم ہے۔

شعر نمبر 3

سب کی سن لیتے ہیں لیکن اپنی کچھ کہتے نہیں
ہے کوئی بھیدی اور ان کا راز داں سب سے الگ

بھیدی = بھید لینے والا۔ کھوجی

راز داں = راز سے واقف

شاعر کہتا ہے کہ یہ آزادگان یوں تو ہر ایک کی بات سن لیتے ہیں، مگر اپنی بات کا اظہار نہیں کرتے۔ گویا خاموش طبع واقع ہوئے ہیں۔ وہ گفتگو میں حد سے زیادہ محتاط نظر آتے ہیں۔ ان لوگوں کے دل کا راز جاننے والا بھی کوئی خاص ہی بندہ ہے۔ وگرنہ عوام کو تو ان کے خیالات و نظریات سے آشنائی نہیں۔ شاعر نے قدیم طرز تمدن اور شرافت و نجابت کے حامل آزاد افراد کے طریق زندگی کو واضح کیا ہے۔

شعر نمبر 4-5

شاعروں کے ہیں سب انداز سخن دیکھے ہوئے
دردمندوں کا ہے دکھڑا اور بیاں سب سے الگ

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالی نے دکاں سب سے الگ

اندازِسخن=شاعری کا انداز

دردمند= درد رکھنے والا۔ ہمدردی کرنے والا

گاہک=خریدار

الطاف حسین حالی کا رنگ سخن ہمیشہ منفرد رہا ہے۔عام روش سے ہٹ کر چلنا ہی ان کا وتیرہ رہا ہے۔قدیم غزل کے ایک شعر میں انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ:

دل پر درد سے کچھ کام لوں گا
اگر فرصت ملی مجھ کو جہاں میں

چنانچہ اپنے منفرد انداز میں دردمند دل کی داستانیں سناتے رہے ہیں اور جدید غزلوں میں مردہ قوم کو خواب خرگوش سے بیدار کرنے کی مہم سر کرتے رہے ہیں۔ حالی اپنے وقت کے عظیم شاعر، مفکر اور مصلح تھے۔ چنانچہ ان کی رہنمائی قوم کے لیے منارہ نور کا کام کرتی ہے اور انھوں نے اس حقیقت کا برملا اظہار ان دو اشعار میں کیا ہے۔

چوتھے شعر میں مروجہ ومقبول شاعری پر جامع تنقید کی ہے۔انھوں نے یہ اعلان کر دیا ہے کہ شاعر اور ہی لوگ کہلائیں، حالی اپنے آپ کو صرف دردمند کہلوانا چاہتے ہیں، یعنی ایسا شخص جس کے دل میں قوم کا درد ہے۔

شعر نمبر 5

مقطع میں جو تعلّی پائی جاتی ہے، وہ روایتی نہیں، بالکل سچی ہے۔کہنا یہ چاہتے ہیں کہ حالی نے اپنی شاعری کی جو دکان سجائی ہے اس میں مال نایاب ہے مگر قوم کو اس کی کوئی خبر نہیں۔ وہ تو پرانے طرز کلام پر فریفتہ ہے۔ نئے دور اور نئے حالات کے تقاضوں کے تحت وہ شاعری کے ذریعے جو بات پیش کر رہے ہیں اس جانب لوگ متوجہ نہیں ہو رہے اور ان کے کلام کی صداقت اور معنویت کو ذرہ برابر اہمیت نہیں دے رہے۔

3.4 غزل نمبر 4

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

یارب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر
تھا اس کو ہم سے ربط مگر اس قدر کہاں
اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیش عشق
رکھی ہے آج لذت زخم جگر کہاں
ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں
حالی نشاط نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب
آئے ہو وقت صبح رہے رات بھر کہاں

تشریح

شعرنمبر1

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

جستجو=تلاش

خوب تر=بہت اچھا۔بہتر

روزاول سے انسان کی یہ فطرت رہی ہے کہ وہ بہتر سے بہتر چیز کی تلاش میں رہتا ہے وہ کسی بھی عمدہ اور نئی چیز پر قناعت نہیں کرتا بلکہ اس سے بہتر شے ڈھونڈنے لگتا ہے۔اس فطرت انسانی نے اسے کبھی چین سے بیٹھنے نہیں دیا بلکہ تلاش وجستجو میں ہمیشہ سرگرداں رکھا اور حالی اس حقیقت کو واضح کرتے ہوئے دراصل یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ انسانی فطرت ہی عروج وارتقاء کی آئینہ دار ہے۔اگر تلاش وجستجو کا جذبہ نہ رہے تو انسان نہ نئی چیزیں دریافت کرسکتا ہے نہ ہی ترقی کی جانب رواں دواں رہ سکتا ہے۔

شعرنمبر2

یارب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر
تھا اس کو ہم سے ربط مگر اس قدر کہاں

اختلاط=ملاپ۔میل جول

انجام بخیر ہونا=انجام کا اچھا ہونا

ربط=تعلق۔لگاؤ

حالی یہ بتا رہے ہیں کہ اس شخص یعنی محبوب کے ساتھ آشنائی تو پہلے سے تھی۔ مگر اس ربط اور لگاؤ میں شدت نہ تھی لیکن اب دوستی محبت میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے ڈر ہے کہ کہیں یہ اختلاط درد والم کی صورت اختیار نہ کرلے زمانہ میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ حالی نے اشارے اشارے میں محبت کی حقیقت بیان کردی ہے اور اس کے متوقع انجام پر تشویش کا اظہار بھی کر دیا ہے۔

شعر نمبر 3

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیش عشق
رکھی ہے آج لذت زخم جگر کہاں

ایک عمر چاہیے = ایک عرصہ چاہیے
نیش = ڈنک

حالی اس شعر میں عشق کو ڈنک سے تشبیہ دے کر بتا رہے ہیں کہ یہ ایک اذیت ناک اور تکلیف دہ چیز ہے۔ عاشق کو طرح طرح کے عذاب سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس کرب اور اذیت کو برداشت کرنے کے لیے ایک عرصہ درکار ہوتا ہے۔ تب کہیں انسان کو نیش عشق گوارا ہوتا ہے اور اسے لذت ملنے لگتی ہے، لیکن مجھے اس وقت زخم محبت میں لذت کیوں کر ملے کہ یہ تو ابھی تازہ تازہ ہے۔ ابھی تو اذیت کا آغاز ہوا ہے ابھی درد میں پختگی کہاں آئی ہے۔ جب ایک مدت غم سہتے سہتے گزر جائے گی تب کہیں لذت ملنے لگے گی۔

شعر نمبر 4

ہم جس پر مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

تجھ سے = تیری طرح

شاعر محبوب سے مخاطب ہو کر یہ کہہ رہا ہے کہ دنیا میں تمھارے جیسے متعدد حسین ہوں گے لیکن تم میں جو خاص وصف ہے وہ کسی اور میں نہیں۔ اس طرح تم لاکھوں پری پیکروں میں منفرد اور یگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ ہماری نظر میں تمھارا جو سراپا سمایا ہوا ہے، وہ کسی اور خوب رو فرد میں موجود نہیں۔ یہی وہ خاص بات ہے جس کی وجہ سے ہم تم پر مرتے ہیں اور تمھاری محبت کا دم بھرتے ہیں۔

شعر نمبر 5

حالی نشاط نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب
آئے ہو وقت صبح رہے رات بھر کہاں

نشاط=خوشی

یہ شعر پند وموعظت سے مملو ہے۔حالی اپنے زمانے کے افراد سے یہ کہہ رہے ہیں کہ عیش وعشرت کی بزم تو رات کو سجائی جاتی ہے اور صبح ہوتے ہی ختم ہو جاتی ہیں۔اب تم لوگ جو صبح کے وقت عیش ومسرت کی تلاش میں آئے ہو تو پہلے یہ تو بتاؤ کہ رات بھر کہاں رہے۔اس شعر کے پردے میں وہ قوم کے افراد سے کہہ رہے ہیں کہ مغلیہ حکومت کو زوال آ چکا ہے اور اس کے ساتھ مسلمانوں کی عیش ومسرت اور خوشحالی بھی ختم ہو چکی ہے۔

3.5 غزل نمبر 5

هوا کچھ اور ہی عالم میں چلتی جاتی ہے
ہنر کی عیب کی صورت بدلتی جاتی ہے
عجب نہیں کہ رہے نیک وبد میں کچھ نہ تمیز
کہ جو بدی ہے وہ سانچے میں ڈھلتی جاتی ہے
قلق انھیں نہیں گر دوستوں سے چھٹنے کا
طبیعت اپنی بھی کچھ کچھ سنبھلتی جاتی ہے
اڑے گی خاک تقدس کی اب سربازار
فقیہہ و شیخ میں جوتی اچھلتی جاتی ہے
نہ خوف مرنے سے جب تھا نہ اب ہے کچھ حالؔی
کچھ اک جھجک تھی سو وہ بھی نکلتی جاتی ہے

تشریح

شعر نمبر 1

هوا کچھ اور ہی عالم میں چلتی جاتی ہے
ہنر کی عیب کی صورت بدلتی جاتی ہے

اپنی غزل کے اس مطلع میں حالی زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کا نقشہ کھینچ رہے ہیں۔انقلاب 1857ء کے بعد پرانی اقدار وروایات ختم ہو رہی تھی اور نئی تہذیب، نیا تمدن، نیا کلچر معرض وجود میں آ رہا تھا۔اب پہلی جیسی صفتیں باقی نہیں رہی تھیں، حتی کہ عیب کی شکل وصورت بھی بدلتی جارہی تھی۔گزرے زمانے کے جو بھی اچھی باتیں، اب وہ صائب نہیں رہی تھیں۔بدلتے ہوئے ماحول نے ماضی کے اوصاف حمیدہ میں یکلخت تبدیلی پیدا کر دی تھی۔گویا مغرب سے درآمد شدہ کلچر نے مشرقی تمدن کے خدوخال بدل کر رکھ دیے تھے

شعرنمبر2

عجب نہیں کہ رہے نیک وبد میں کچھ نہ تمیز
کہ جو بدی ہے وہ سانچے میں ڈھلتی جاتی ہے

اب زمانہ ایسا آ گیا ہے کہ نیکی اور بدی میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہے گا۔ نہ تو برائی برائی رہے گی اور نہ اچھائی کا کوئی نام باقی رہے گا۔حتی کہ بدی بھی نئے انداز اور سانچے میں ڈھل رہی ہے اور اس کی رکاکت وضلالت ختم ہوتی جارہی ہے گویا حالی نے معاشرے کی اخلاقی پستی کا نقشہ کھینچا ہے اور مذموم اثرات پر اپنے دکھ کا اظہار کیا ہے۔

شعرنمبر3

قلق انھیں نہیں گر دوستوں سے چھٹنے کا
طبیعت اپنی بھی کچھ کچھ سنبھلتی جاتی ہے

قلق=صدمہ

اگر ہمارے واقف کاروں کو اس بات کا ذرا بھی صدمہ نہیں کہ زمانے کے ہاتھوں ہم جیسے دوست ادھر ادھر منتشر ہو گئے ہیں تو ہم میں ان سے چھٹنے کے صدمے کو برداشت کرنے کی سکت پیدا ہو رہی ہے۔ حالی نے اس شعر میں انسان کی نفسیاتی کیفیت بیان کی ہے کہ جب واقف کاروں کو دوستوں سے چھٹنے کا غم نہیں ہوتا تو بالآخر دوست بھی انھیں آہستہ آہستہ فراموش کر جاتے ہیں اور جدائی کی جو کسک دل میں پیدا ہوتی ہے اس پر رفتہ رفتہ قابو پا لیا جاتا ہے۔

شعرنمبر4

اڑے گی خاک تقدس کی اب سربازار
فقیہہ و شیخ میں جوتی اچھلتی جاتی ہے

تقدس = پاکی۔ پاکیزگی۔ پارسائی
خاک اڑنا = بدنام ہونا۔ رسوا ہونا۔ برباد ہونا
سربازار = منظر عام پر۔ سب کے سامنے
فقیہہ = مفتی دین
شیخ = پیر۔ مرشد
جوتی اچھلنا = لڑائی فساد ہونا

اس شعر میں حالی اس حقیقت کا اظہار کر رہے ہیں کہ اس زمانے میں تقدس کا بھرم بھی باقی نہیں رہا ہے۔ اب

پارسائی بھی کھلے عام بدنام ہوتی جارہی ہے۔حتیٰ کہ مفتی دین اور پیر طریقت بھی آپس میں دست وگریباں ہورہے ہیں ۔بادی النظر میں یہ حقیقت بیان کی جارہی ہے کہ مذہبی اتحاد و یگانگت کا نام ونشان نہیں رہا اور فرقہ پرستی کی بدولت تقدس کی خاک اڑنے لگی ہے۔ایسی صورت حال میں جب فقیہہ وشیخ میں جنگ وجدال جاری ہو، مذہبی تقدس، روحانی اقدار اور تہذیبی روایات کہاں برقرار رہ سکیں گی جو افراد شرافت نجابت کا منبع ہیں، وہیں دست وگریباں ہوجائیں تو عوام الناس کی صحیح رہنمائی کون کرے گا۔پھر نہ تو تقدس نام کی کوئی چیز باقی رہے گی نہ ہی شرافت کا کہیں نام ونشان نظر آئے گا۔

شعر نمبر 5

نہ خوف مرنے سے جب تھا نہ اب ہے کچھ حالؔی
کچھ اک جھجک تھی سو وہ بھی نکلتی جاتی ہے

جھجک = کشش وپنج۔ہچکچاہٹ

حالی خود سے مخاطب ہو کر کہہ رہے ہیں کہ مجھے مرنے کا خوف کبھی نہیں رہا۔میں موت سے پہلے ڈرتا تھا نہ اب ڈرتا ہوں۔ہاں، ایک ہچکچاہٹ کی کیفیت تھی جو فطرت انسانی کا تقاضا ہے۔مگر یہ جھجک بھی اب ختم ہوتی جارہی ہے۔اب میں مرنے کے لیے پوری طرح تیار ہوں۔اس مقطع میں ایک نفسیاتی کیفیت پیش کی گئی ہے۔جب تک انسان کا ذہن ودل ودنیاوی جھمیلوں میں الجھا رہتا ہے، اسے موت کا سامنا کرتے ہوئے جھجک سی محسوس ہوتی ہے، لیکن جب دل دنیا سے اچاٹ ہوجاتا ہے تو یہی موت آرزو کی صورت اختیار کرلیتی ہے اور کوئی خوف نہیں رہتا۔

4۔ خود آزمائی

1۔ حالی کی قدیم غزلیں کن خصوصیات کی حامل ہیں؟ تفصیل سے جواب دیجیے اور نمونے کے طور پر اشعار بھی پیش کیجیے۔

2۔ حالی کی جدید غزلوں میں ناصحانہ رنگ کیوں کر پیدا ہوا؟ اردو شاعری پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے؟ واضح کیجیے۔

3۔ اردو کے غزل گو شعرا میں حالی کا مقام و مرتبہ متعین کیجیے۔

4۔ مندرجہ ذیل اشعار کی تشریح کیجیے:

مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالی نے دکاں سب سے الگ

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

5۔ مجوزہ کتب برائے مطالعہ

1۔ الطاف حسین حالی، کلیات حالی (جلد اول)، مرتب افتخار احمد صدیقی، مجلس ترقی ادب، لاہور، 1968ء

2۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی، حالی بہ حیثیت شاعر، ادارہ فروغ اردو، لکھنو، 1960ء

3۔ ڈاکٹر صالحہ عابد حسین، یادگار حالی، انجمن ترقی اردو، دہلی، 1986ء

4۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، ولی سے اقبال تک، چمن بک ڈپو، نئی دلی، 1985ء

5۔ شمیم فاروقی، حالی فن اور شخصیت، ساہتیہ اکیڈمی، چندی گڑھ، 1986ء

6۔ غالب نامہ، الطاف حسین حالی نمبر، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دلی، 2002ء

یونٹ نمبر 7

غزلیاتِ حسرت موہانی

تحریر: ڈاکٹر محمود الرحمٰن
نظر ثانی: پروفیسر ڈاکٹر محمد کامران

فہرست

یونٹ کا تعارف

زیرِنظر یونٹ میں آپ مولانا حسرت موہانی کی شخصیت اور شاعری کا مطالعہ کریں گے اور ان کی منتخب غزلوں کا جائزہ لیں گے۔ یہاں یہ بتا دیا جائے تو مناسب ہوگا کہ سید فضل الحسن حسرت موہانی اردو زبان کے ایک اہم ستون اور بلند مرتبت غزل گو شاعر تھے۔ تاریخ ادب کے تسلسل میں حسرت کا شمار نئی غزل جس کی بنیاد حالی نے رکھی تھی کے اہم نمائندے ہیں انھیں رئیس المتغزلین کے نام سے بھی یاد کیا جائے گا۔

اگرچہ حسرت کی تمام زندگی عملی طور پر سیاست میں گزری اور اس کا اکثر و بیشتر حصہ جیلوں میں گزرا لیکن انھوں نے قید بامشقت کے ساتھ ساتھ شاعری کا مشغلہ بھی جاری رکھا، بقول حسرت موہانی:

ہے مشقِ سخن جاری، چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

یونٹ کے مقاصد

امید ہے کہ اس یونٹ کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو سکیں گے کہ:

1۔ ایک غزل گو کی حیثیت سے حسرت موہانی کی عظمت و سربلندی کا تعین کر سکیں۔
2۔ حسرت کے رنگ تغزل کو نمایاں کر سکیں۔
3۔ حسرت کی غزلیات کے مقبول عام ہونے کی وجوہات بیان کر سکیں۔
4۔ نئی غزل کے پیش رو کے طور پر حسرت موہانی کا مرتبہ متعین کر سکیں۔
5۔ یونٹ میں شامل حسرت کی غزلوں کا بغور مطالعہ کر کے ان کی مناسب تشریح کر سکیں۔

1۔ سید فضل الحسن حسرت موہانی

(1875ء۔1955ء)

1.1 سوانح

مولانا فضل الحسن حسرت موہانی کی شخصیت مختلف اوصاف کا مجموعہ تھی۔ وہ ایک طرف اردو کے بلند پایہ ادیب اور غزل گو شاعر تھے تو دوسری طرف ممتاز سیاسی لیڈر، عظیم قومی رہنما، بے باک انسان اور تحریک آزادی کے سرگرم کارکن تھے۔ بائیں ہمہ وہ ایک صوفی باصفا تھے۔ ان کی درویشی میں نہ تعلّی تھی نہ مکروفریب کا شائبہ۔ وہ قناعت واستغنا کا پیکر تھے اور بلاشبہ ایک عظیم انسان۔

حسرت کی پیدائش 1875ء میں ضلع اناؤ (یوپی) کے ایک قصبے موہان میں ہوئی۔ یہ بستی علم وادب کا گہوارہ سمجھی جاتی تھی۔ مولانا کا سلسلہ نسب حضرت امام علی موسیٰ رضا سے جا ملتا ہے۔ ان کے والد کا نام سید اظہر حسن تھا۔ ان کا خاندان نقل مکانی کر کے نیشاپور سے ہندوستان آیا تھا اور موہان میں سکونت اختیار کی۔ حسرت موہانی کی ابتدائی تعلیم پرانے طرز پر ہوئی تھی۔ انھوں نے اردو اور فارسی کی ابتدائی کتابیں قصبے کے مولوی صاحبان سے پڑھی تھیں۔ پھر انھیں موہان مڈل سکول میں داخل کیا گیا جہاں سے 1894ء میں انھوں نے مڈل کا امتحان پاس کیا اور تمام صوبے میں اوّل آئے۔

مولانا حسرت کے والد بہ سلسلہ جائیداد فتح پور میں مقیم تھے۔ چنانچہ یہ بھی مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے وہیں تشریف لے گئے اور میٹرک کا امتحان نہایت اعزاز کے ساتھ پاس کیا۔ مزید تعلیم کے لیے علی گڑھ گئے اور 1903ء میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔

حسرت موہانی نے فارغ التحصیل ہونے کے فوراً بعد یعنی 1904ء میں سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ اس مہم کا آغاز ان کے مشہور ادبی وسیاسی جریدے ''اردوئے معلیٰ'' سے ہوا۔ انھوں نے یہ رسالہ علی گڑھ سے جاری کیا تھا۔ اس میں ادبی اور مذہبی موضوعات کے علاوہ سیاست کے موضوع پر بھی نہایت اہم مضامین شائع ہوتے تھے۔

اسی زمانے کا ایک اہم واقعہ ہے کہ حسرت موہانی نے عربی زبان میں شائع ہونے والے رسالے میں انگریزوں کے خلاف لکھے گئے مضمون بہ عنوان ''مصر میں انگریزی سیاست'' کا ترجمہ ایک ہونہار طالب علم (مسمی اقبال سہیل) سے کروا کر چھاپ دیا۔ مترجم کا نام نہیں دیا گیا تھا۔ جب برطانوی حکام نے مترجم کا نام دریافت کیا تو حسرت نے ایک سچے صحافی کی حیثیت سے نام بتانے سے بالکل انکار کر دیا اور مذکورہ مضمون کی اشاعت کی تمام ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ چنانچہ ان پر ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشرز کی حیثیت سے مقدمہ چلا گیا اور انھیں دوسالہ قید بامشقت کی سزا ہوئی۔ یہ پہلی قید فرنگ تھی۔ بعد میں تحریک آزادی کے سلسلے میں انھیں بار بار جیل جانا پڑا، لیکن جابر حکمرانوں کے آگے کبھی سرِ تسلیم خم نہ کیا۔ ایسے جاں گسل عالم میں بھی وہ ادب کی خدمت کرتے رہے۔

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

دنیائے ادب کے درخشندہ ستارے، ایک بلند پایہ غزل گو، عظیم سیاسی رہنما دار ورسن کی آزمائش سے گزرنے والے مولانا فضل الحسن حسرت موہانی 13 مئی 1951ء کو لکھنو میں انتقال کر گئے پروفیسر رشید احمد صدیقی نے جو باتیں لکھی ہیں وہ حسرت کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔

''ایسا نڈر، محبت کرنے والا اور محبت کے گیت گانے والا اب کہاں سے آئے گا کسی نہ دبنے والا، ہر شخص پر شفقت کرنے والا، زبان کا نباض، شاعروں کا والی، غزل کا امام، ادب کا خدمت گزار، کیسی سچی بات کسی نے کہی کہ سیاست کوئلے کا کاروبار ہے جس میں سبھی کا ہاتھ تھوڑا بہت کالا ہوتا ہے۔ سوائے حسرت کے!''

(رسالہ، آج کل، نئی دہلی، اکتوبر ۱۹۵۲ء، ص ۱۶)

1.2 قدیم وجدید رنگ سخن کی آمیزش

اردو غزل گوئی میں حسرت موہانی کا ایک اہم مقام ہے۔ انھوں نے اس صنف سخن کو جو آب ورنگ عطا کیا ہے۔ اس کی بدولت وہ رئیس المتغزلین کہے جاتے ہیں۔ انھوں نے حسن وعشق کی نفسیات کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں عاشقانہ جذبات اور واردات قلبی کو بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

جس دور میں حسرت موہانی نے اپنی غزل گوئی کا آغاز کیا تھا، اس وقت یہ صنف سخن اپنے بلند مقام اور مرتبے سے گر چکی تھی۔ جلال لکھنوی، صفی لکھنوی، نسیم لکھنوی اور شاد عظیم آبادی جیسے شعرا نے اسے پروان چڑھانے کی مقدور بھر کوشش ضرور کی تھی لیکن اس اقدام کے باوجود یہ لوگ دنیائے تغزل میں انقلاب برپا نہ کر سکے۔ یہ تاریخی کارنامہ مولانا حسرت موہانی نے انجام دیا کہ قدیم وجدید دونوں رنگوں کو باہم ملایا اور اس نئے رنگ کو بہ حسن وخوبی برقرار رکھا۔

یہ حقیقت ہے کہ مولانا حسرت موہانی نے اساتذہ اردو کے مختلف اسلوب کو یکجا کر کے قوس وقزح کی صورت پیدا کر دی۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ قطعاً اخذ نہ کیا جائے کہ ان کی شاعری مختلف دبستان شاعری کا ایک ملغوبہ ہے۔ اس کے برعکس اس میں ان کا انفرادی رنگ بدرجہ اتم موجود ہے۔ ہر شعر میں ان کی منفرد شخصیت پوری طرح جلوہ گر ہو رہی ہے۔ یہ حسرت کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ کلاسیکی انداز میں جدیدیت پیدا کی ہے اور پرانے طرز میں نیا پن اجاگر کیا ہے اور یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔

1.3 محاسن کلام

حسرت موہانی کی سب سے بڑی شاعرانہ خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے زبردستی شعر کہنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ یعنی ان کے کلام میں آورد کا شائبہ نظر نہیں آتا ہے۔ ان کی سخن سنجی کی صورت کچھ یوں رہی کہ قید خانوں کی تنہائی میں فرصت ملی

تو شعر کہے۔سفر کے دوران موقع مل گیا تو غزل ہوگئی۔گویا اس طرح ذاتی مشاہدات، قلبی واردات اور سچے تجربات شعر کے قالب میں ڈھل گئے۔یہی سبب ہے کہ حسرت کا ہر شعر تاثر کا مرکز بن گیا۔

مولانا نہایت پاکیزہ مزاج اور پاک باز انسان تھے۔عیش وعشرت سے انھیں دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ان کی عاشقانہ شاعری میں ابتذال نہیں پایا جاتا۔جو بھی اور جیسے بھی جذبات ہیں، سچے اور صالح ہیں۔نیز، ان کے کلام میں جو دلکشی، حسن اور زیبائی پائی جاتی ہے، اس کی تمام تر وجہ دراصل الفاظ کی شیرینی ہے۔حسرت الفاظ کے انتخاب کا خاص خیال رکھتے تھے وہ اس کے متعلق خود کہتے ہیں:

''شاعری اور استادی کا صرف یہی کمال نہیں کہ مضمون بند ہو اور زبان صحیح یا ردیف کھلتی ہوئی ہو اور قافیہ تازہ بلکہ ان سب باتوں کے علاوہ سب سے بڑی خوبی جو سب سے بڑھ کر مشکل، لیکن سب سے زیادہ قابل لحاظ ہے، وہ انتخاب الفاظ سے متعلق ہے۔''

حسرت موہانی کی غزلوں میں موسیقیت کا رچاؤ، نرم ولطیف انداز بیان، فارسی ترکیبوں کا حسن، متوازن خیالات اور الفاظ کا صحیح انتخاب پایا جاتا ہے۔یہ ساری خصوصیات مل کر ان کے کلام کو عظمت عطا کرتی ہیں جو ان کے زمانے کے کسی اور شاعر میں کم ہی پائی جاتی ہیں۔

اگر ہم ان کی شاعری کا بغور مطالعہ کریں تو یہ حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ ان کی غزل سرائی عشق ومحبت کی قلبی وارداتوں اور اس کی جاودانی کیفیتوں کی داستان ہے۔ان کے نزدیک زندگی کی محبت سے عبارت ہے۔اس کے بغیر زندگی بے کیف اور بے رنگ رہتی ہے۔

1.4 حسرت کا تصور محبوب

حسرت نے اپنے کلام میں عشق ومحبت کے مختلف مدارج کو بڑی خوبی سے واضح کیا ہے اور اپنے تخیل کی مدد سے تغزل کی شان پیدا کر دی ہے۔حسرت عشق ومحبت کے نشیب وفراز کو خوب جانتے تھے۔اس کی شدت اور حرکت، کیفیت اور تموج کے ہر راز سے واقف تھے۔وہ حسن کی عظمت سے بخوبی آشنا تھے۔لیکن اس واسطے سے کہ اس میں بیان، تمنا اور زبان محبت کو سمجھنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔

حسرت موہانی نے اپنی غزلوں کو شعریت کے علاوہ کسی دوسرے خارجی محرک سے آلودہ نہیں کیا۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ انھیں اپنے اندرونی جذبوں تجربوں پر کامل اعتماد تھا۔چنانچہ بلا جھجک یہ کہہ سکتے ہیں کہ مولانا کی شاعری خالص انسانی جذبات کی مظہر ہے نہ مبالغہ آرائی ہے، نہ تصنع، نہ تکلف! ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے حسرت کی شاعری کے حوالے سے بہت پتے کی بات کی ہے:

''حسرت کے یہاں عشق وحسن طلب ومطلوب کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ان کی

عشقیہ شاعری میں ایک سیدھے سادھے انسان کے دل کا معاملہ پیش کیا گیا ہے۔ کوئی خیالی محبوب نہیں جس کے لیے وہ اپنی جان کھپائیں اور نہ وہ آسمانی محبت کی عرفانی جھلکیوں سے اپنی نظر کو خیرہ ہونے دیتے ہیں...... یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں ایک چلتے پھرتے محبوب کی پرچھائیاں دکھائی دیتی ہیں۔ ان کے محبوب کا ناز و انداز بھی خیالی نہیں حقیقی ہے۔''

(حسرت کی شاعری، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دلی، ۱۹۸۳ء، ص ۱۲/۱۱)

حسرت موہانی نے اپنی عشقیہ شاعری کو تجرید کے الجھاؤ میں کبھی نہیں پھنسایا۔ ان کا تغزل سراسر داخلی ہے جس سے جذبے کی اندرونی دنیا میں جنبش اور حرکت پیدا کرنا مقصود ہے۔ گویا حسرت خارجی دنیا کو اسی کے اندر سمولینا چاہیے اور وجدانی طور پر پڑھنے والے کا رشتہ کائنات کے ساتھ مربوط کر دیتے ہیں۔

حسرت کی عشقیہ غزلوں کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنی محبت کی داستان کو مایوسی اور نامرادی کی لے پر ختم نہیں کرتے۔ وہ بڑے ہی پر امید واقع ہوئے تھے اور یہ حقیقت ہے کہ اردو کے غزل گو شاعروں میں کوئی بھی ان جیسا پر امید واقع نہیں ہوا ہے۔ حسرت موہانی کی غزلوں کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انھیں کامیاب و کامران ہونے کا یقین رہتا ہے اور یہ کہ آرزوئیں پوری ہوں گی۔

ستم ہو جائے تمہید کرم ایسا بھی ہوتا ہے
محبت میں بتا اے ضبط غم ایسا بھی ہوتا ہے

1.5 کلام حسرت واقعیت اور رجائیت کا استعارہ

مشہور نقاد پروفیسر کلیم احمد نے حسرت موہانی کے عہد کی غزل گوئی کو جدید غزل گوئی قرار دیا ہے اور علمیت و ادبیت کو اس کی امتیازی صفات قرار دیا ہے، جس کی بدولت نئی لفظیات، تراکیب اور استعارات کا غزل میں اضافہ ہوا اور اسی وجہ سے جدید ذہن کی آمد کا احساس اجاگر ہوا۔ کلیم الدین احمد کی اس رائے میں یہ اضافہ ضرور کرنا ہوگا کہ اس جدید غزل میں ایک صفت اور بھی ہے اور وہ ہے راست اظہار۔ یہ خیال اب برقرار نہیں رہا کہ غزل میں بات جب تک چھپا کر نہ کہی جائے، قابل قبول نہیں۔ اب تو راست اظہار اس دور کے سبھی شعرا کی نمایاں خصوصیت بن چکی ہے، مگر حسرت موہانی کی غزلوں میں یہ صفت اوروں کے مقابلے میں بہت زیادہ نمایاں ہے۔ وہ سیاسی موضوعات سے لے کر عشق تک ہر بات بے محابا کہتے ہیں۔ عشق کے نازک ترین معاملات بھی جنھیں استعاروں اور کنایوں میں کہنا مناسب سمجھا جاتا تھا۔ حسرت کھل کر کہتے رہے اس لیے انھوں نے اپنی غزلوں میں جو کچھ کہا اس میں جہاں معصومیت دکھائی دیتی ہے وہاں یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ انھیں خود پر پورا اختیار بھی ہے جو انھیں ابتذال کی حدوں میں داخل نہیں ہونے دیتا۔

المختصر رئیس المتغزلین حسرت موہانی نے غزل کونئی زندگی بخشی۔ غزل ہی ان کی شاعری کا حاصل ہے۔انھوں نے بہت کچھ کہااور جو کچھ بھی کہا غزل ہی کے پیرائے میں کہا۔ ہم بلا ریب، ان کی غزل کو اردو غزل کا نمائندہ قرار دے سکتے ہیں۔ نیز یہ بات بھی بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ ان کی زندگی ان کی شاعری ہے اور ان کی شاعری ان کی اپنی زندگی کا عکس ہے۔ چنانچہ حسرت موہانی کا یہ کہنا ہرگز تعلیٰ اور خودستائی نہیں بلکہ حقیقت کا بین اظہار ہے:

اے وہ کہ تجھے شوق ہے تحسین سخن کا
میرا جو کہا مان تو حسرت کی غزل دیکھ

2۔ اہم نکات

1۔ حسرت موہانی جدید غزل گوشعرا میں انفرادی شان اور نمایاں مقام کے مالک ہیں۔

2۔ حسرت کا کلام قدیم اساتذہ غزل کے مختلف رنگوں کا حسین گلدستہ ہے۔

3۔ حسرت کی شاعری کا محور عشق ومحبت ہے۔

4۔ حسرت کی شاعری کی نمایاں خصوصیت اس کی سادگی اور سلاست ہے۔

5۔ ان کی غزلوں میں نہ تو خیال کی پیچیدگی ہے اور نہ ہی صنائع بدائع کی بھر مار بلکہ ایک توازن واعتدال کی کیفیت ملتی ہے۔

6۔ ان کے کلام میں نرمی روانی اور شگفتگی بدرجہ اتم موجود ہے۔

7۔ انھوں نے واردات قلبی کا بیان جس انداز سے کیا ہے اور اس میں سادگی و پرکاری سے جس جس طرح کے پہلو نکالے ہیں وہ ان کی جذباتی بصیرت اور فنی پختگی کی دلیل ہیں۔

8۔ حسرت حسن وعشق کے معاملات کونہایت معصوم اور پاکیزہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔اس میں رکاکت کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔

9۔ حسرت کی غزلوں میں جوصداقت،واقعیت،اصلیت،زندگی اور حقیقت کی فضا ملتی ہے،اس کے عناصر اجنبی نہیں ہوتے۔

10۔ حسرت کے کلام میں ایک مجاہدانہ عزم کی جلوہ گری ہے۔وہ زندگی سے ہمت ہارتے نظر نہیں آتے۔

11۔ دنیائے غزل میں انقلاب برپا کرنے کا تاریخی فریضہ حسرت موہانی نے ہی پورا کیا ہے۔

12۔ حسرت کوزبان وبیان پر بڑا عبور حاصل ہے۔

13۔ ان کے اشعار میں جس قدر فن کا رچاؤ اور خلوص کا عنصر ملتا ہے،وہ ان ہی کا حصہ ہے۔

14۔ حسرت ایک نقاد بھی تھے،چنانچہ اسی نقادانہ صلاحیت نے ان کی غزل کوفنی بلندیوں اور ادبی رفعتوں سے مالا مال کر دیا ہے۔

3۔ تشریحات

3.1 غزل نمبر 1

حسن بے پروا کو خودبیں و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہار تمنا کردیا
بڑھ گئیں تم سے تو مل کر اور بھی بیتابیاں
ہم یہ سمجھتے تھے کہ اب دل کو شکیبا کردیا
اب نہیں دل کو کسی صورت کسی پہلو قرار
اس نگاہ ناز نے کیا سحر ایسا کر دیا
عشق سے تیرے بڑھے کیا کیا دلوں کے مرتبے
مہر ذروں کو کیا، قطروں کو دریا کر دیا
سب غلط کہتے ہیں لطف یار کو وجہ سکوں
درد دل اس نے تو حسرت اور دونا کر دیا

تشریح

شعر نمبر 1

حسن بے پروا کو خودبیں و خود آرا کر دیا
کیا کیا میں نے کہ اظہار تمنا کردیا

حسن بے پروا= مراد محبوب ہے جو اپنے حسن و جمال سے بے خبر ہے۔

خودبیں= خود پرست۔ خود پسند۔ مغرور

خودآرا= اپنے آپ کو سنوارنے والا

شاعر کہتا ہے ک محبوب کو اپنے حسن کے بارے میں پہلے سے کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ اسے مطلق یہ خبر نہ تھی کہ وہ کس قدر حسین و جمیل ہے۔ لیکن جب میں نے عشق کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے جذبات دروں اور بے تابی شوق کا اظہار کر دیا تو نتیجۃً محبوب میں اپنے حسن بے پایاں کا شعور پیدا ہو گیا اور وہ جو اپنے جمال سے قطعاً بے پروا تھا وہی اب آرائش اور اپنے حسن کے جلوؤں میں کھو گیا۔ اب شاعر کو تاسف ہو رہا ہے کہ میں نے اظہار تمنا کیوں کر دیا۔ اب تو محبوب میں خود پسندی کے آثار پیدا ہو گئے اور غرور و ناز اس کی فطرت ثانیہ بن گئی۔

اس مطلع میں ابتدائے عشق کا ذکر نہایت حسین پیرائے میں کیا گیا ہے۔

شعر نمبر 2

بڑھ گئیں تم سے تو مل کر اور بھی بیتابیاں
ہم یہ سمجھتے تھے کہ اب دل کو شکیبا کر دیا

شکیبا=صبر کرنے والا۔ برداشت کرنے والا۔ مطمئن

شاعر کہتا ہے کہ جب ہم محبوب سے دور تھے تو یہی سمجھتے تھے کہ ہمارے دل کی بے چینیوں کا سبب اس سے دوری ہے۔ چنانچہ یہ خیال تھا کہ جب اس سے ملاقات ہوگی تو دل کو سکون مل جائے گا اور اضطراب جاتا رہے گا۔ مگر ہوا یہ کہ جب وہ ملا تو دل کی بے چینی پہلے سے بھی کہیں زیادہ بڑھ گئی۔ اس شعر میں حسرت نے ایک باریک نفسیاتی نکتہ پیش کیا ہے۔ ان کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ محبوب کی قربت کے نتیجے میں شوق پہلے سے دو چند ہو گیا اور دل کا صبر و قرار جاتا رہا۔

شعر نمبر 3

اب نہیں دل کو کسی صورت کسی پہلو قرار
اس نگاہ ناز نے کیا سحر ایسا کر دیا

نگاہ و ناز=محبوبانہ نظر۔ ناز و ادا کی نظر

سحر= جادو

شاعر کہتا ہے کہ پہلے ہماری زندگی میں سکون و اطمینان تھا لیکن اب نہ چین ہے نہ راحت۔ کسی طرح بھی اطمینان حاصل نہیں ہوتا اور یہ ساری کیفیت محبوب کی جادو نگاہی کا نتیجہ ہے۔ جب سے اس نے ہمیں محبوبانہ نظر سے دیکھا ہے۔ دل کا سکون ناپید ہو گیا ہے۔ مراد یہ ہے کہ ہماری بے تابی و بے قراری عشق کا نتیجہ ہے۔

شعر نمبر 4

عشق سے تیرے بڑھے کیا کیا دلوں کے مرتبے
مہر ذروں کو کیا، قطروں کو دریا کر دیا

شاعر محبوب سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ ہمارے نزدیک محبت کوئی روگ، کوئی آزار نہیں بلکہ یہ تو زندگی کو بنانے اور سنوارنے والی ایک قوت ہے۔ چنانچہ تیری محبت سے ہمارے دل کا مرتبہ اور بھی بلند ہو گیا ہے۔ پھر مثال دے کر یہ کہتا ہے کہ اے محبوب! تیرے عاشقوں کے دل اگر پہلے ذروں کی طرح تھے تو اب سورج کی طرح درخشاں ہیں۔ اگر یہ دل پہلے قطروں کی طرح محدود تھے تو اب دریا کی طرح وسیع و عریض ہیں۔

عشق کے اثرات کو حسرت نے اپنے ایک دوسرے شعر میں یوں بیان کیا ہے:

ترے عشق میں کیا سے کیا ہو گئے ہم
سیاہ کار تھے باصفا ہو گئے ہم

شعر نمبر 5

سب غلط کہتے ہیں لطف یار کو وجہ سکوں
درد دل اس نے تو حسرت اور دونا کر دیا

لطف یار=محبوب کی عنایت۔مہربانی

دونا=دوگنا

شاعر کہتا ہے کہ ہم ہمیشہ یہ سنا کرتے تھے کہ محبوب کے التفات سے دل کو تسکین ملتی ہے اور بے چینی جاتی رہتی ہے۔لیکن تجربے سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ یہ خیال سراسر غلط ہے کیونکہ محبوب کی عنایت اور مہربانی نے تو ہمارے دل کی خلش کو پہلے سے بھی زیادہ بڑھا دیا ہے۔

حسرت موہانی نے اس مقطع میں واقعات عشق کے ساتھ محبت کی نفسیات کو نہایت فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔

3.2 غزل نمبر 2

جاں فزا تھی کس قدر یا رب ہوائے کوئے دوست
بس گئی جس سے مشامِ آرزو میں بوئے دوست
بے خودی میں اب نہیں کچھ امتیاز وصل و ہجر
رات دن پیشِ نظر ہے جلوۂ نیکوئے دوست
ہوچکی اب ہم گرفتارانِ فرقت کونصیب
آہ وہ خوشبو کہ تھی پروردۂ گیسوئے دوست
بن گئی محفل کی محفل اک طلسم بے خودی
چل گیا آخر فسونِ نرگسِ جادوئے دوست
شعر حسرت ہم نے یہ مانا کہ نازک ہے بہت
اس سے بھی کچھ بڑھ کے نازک ہے مگر خوشبوئے دوست

تشریح

شعر نمبر 1

جاں فزا تھی کس قدر یا رب ہوائے کوئے دوست
بس گئی جس سے مشامِ آرزو میں بوئے دوست

جاں فزا=فرحت انگیز،مسرت بخش،دل خوش کرنے والا

مشام=مشم کی جمع۔دماغ میں سونگھنے کی قوت کی جگہ

شاعر خدا سے مخاطب ہوکر کہتا ہے کہ یارب! کوچہ یار کی ہوا کتنی فرحت انگیز اور مسرت بخش تھی۔ذہن و دل اس سے کس درجہ مسحور تھے۔ایک وجدانی کیفیت جسم و جاں پر طاری تھی۔دوست کے کوچے کی یہ ہوا اتنی طرب خیز تھی کہ میری آرزوں اور تمناؤں کے مشام میں خود محبوب کی خوشبو رچ بس گئی تھی۔یہاں حسرت تصورات کی مدد سے یہ واضح کر رہے ہیں کہ کوچہ یار میں چلنے والی ہوا نے خود محبوب کے جسم و جاں کی خوشبو میرے دماغ میں بسا دی ہے۔کیفیت عشق کی ترجمانی موثر پیرائے میں کی گئی ہے۔

شعر نمبر 2

بے خودی میں اب نہیں کچھ امتیاز وصل و ہجر
رات دن پیش نظر ہے جلوۂ نیکوئے دوست

نیکو=اچھا۔خوب۔عمدہ

شاعر کہتا ہے کہ عشق محبوب میں میں سرشار ہوں مجھ پر یک گونہ بےخودی کی کیفیت طاری ہے۔اب ایسی حالت میں نہ تو وصال محبوب کا احساس ہے نہ ہی فراق یار کا صدمہ۔اب تو میرے پیش نظر خوش شکل خوب رو اور خوش جمال دوست کا جلوہ ہی رہتا ہے۔میں اسی تصور یار میں کھویا ہوا ہوں اور اس درجہ کو نہ تو وصال کا پتہ چلتا ہے نہ ہی فرقت کا احساس ہوتا ہے ۔اب دونوں میں تمیز کرنا میرے مشکل ہے اور یہ نتیجہ ہے تصور جاناں کا۔

شعر نمبر 3

ہو چکی اب ہم گرفتارانِ فرقت کو نصیب
آہ وہ خوشبو کہ تھی پروردۂ گیسوئے دوست

گرفتار فرقت=محبوب کی جدائی کے اسیر

پرورده=پالا ہوا۔پرورش کیا ہوا

شاعر کہتا ہے کہ جب محبوب تک رسائی حاصل تھی تو اس کے معطر گیسوں کی خوشبو ہمارے مشام جاں کو فرحت بخشتی تھی۔اس کی محفل کی فضا،اس کی بزم کی ہوا اور اس کی قربت میں میسر ہونے والی مسرت بخش خوشبوئے گیسو ہمیں شاد کا کام رکھتی تھی۔ ہمارح سرشار تھی۔لیکن اب وہ بہار جاں فزا کہاں میسر! ہم فرقت کے مارے بزم یار سے بہت دور ہیں۔جدائی نے ہمیں رنگینی محفل سے محروم کر دیا ہے۔اب ہمیں صحبت یار کہاں نصیب ہوگی۔اب خوشبوئے گیسو دوست سے مشام جاں کو معطر کرنے کے مواقع کیوں کر مل سکیں گے۔فرقت یار کی کیفیت کو موثر پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔

شعر نمبر 4

بن گئی محفل کی محفل اک طلسم بے خودی
چل گیا آخر فسونِ نرگسِ جادوئے دوست

فسوں = جادو۔سحر

نرگس = ایک پھول جسے شعرا آنکھ سے تشبیہ دیتے ہیں۔مجازاً محبوب کی نشیلی آنکھ

شاعر کہتا ہے کہ محبوب نے اپنی مخمور اور نشیلی آنکھوں سے جب محفل پر نظر ڈالی اور متوالے انداز میں بیٹھنے والوں کو دیکھا تو سبھوں پر بے خودی کیا یک کیفیت طاری ہوگئی۔سب پر نرگس مخمور نے سحر کر دیا۔ہر ایک دم بخود ہو کر رہ گیا حسرت نے جمال یار کی ایک سحر انگیز کیفیت کو نہایت موثر انداز میں پیش کیا ہے۔

شعر نمبر 5

شعر حسرت ہم نے یہ مانا کہ نازک ہے بہت
اس سے بھی کچھ بڑھ کے نازک ہے مگر خوشبوئے دوست

حسرتؔ نے اپنی غزل کے اس مقطع میں نہایت خوب صورتی سے اپنی شاعری کی خصوصیات بیان کی ہیں وہ کہتے ہیں کہ میری غزلوں میں محبوب کے حسن و جمال،ناوادا اور عشوہ غمزہ کا ذکر ہوتا ہے اور ان وجوہات کی بنا پر میرا ہر شعر نازک محسوس ہوتا ہے۔نیز دوسری شاعرانہ خصوصیات اپنانے کی وجہ سے بھی اس میں نزاکت پیدا ہو جاتی ہے لیکن وہ ایک قدم آگے بڑھ کر یہ اعلان کرتے ہیں کہ دوست کے جسم و جاں کی خوشبو اور حسین پیراہن کی بو باس میرے شعر کی نزاکت سے کہیں زیادہ نازک ہے۔حسرت نے نہایت فنکارانہ انداز میں خوشبوئے دوست کی نزاکت و لطافت کو آشکار کیا ہے۔اس انداز میں شان تغزل پوری طرح جلوہ گر ہو رہی ہے۔

3.3 غزل نمبر 3

روشن جمال یار سے ہے انجمن تمام
دہکا ہوا ہے آتش گل سے چمن تمام
اللہ رے جسم یار کی خوبی کہ خود بخود
رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام
دیکھو تو چشم یار کی جادو نگاہیاں
بے ہوش اک نظر میں ہوئی انجمن تمام
اچھا ہے اہل جور کیے جائیں سختیاں
پھیلے گی یوں ہی شورش حب وطن تمام
شیرینی نسیم ہے ، سوز وگداز میر
حسرت ترے سخن پہ ہے لطفِ سخن تمام

تشریح

شعر نمبر 1

روشن جمال یار سے ہے انجمن تمام
دہکا ہوا ہے آتش گل سے چمن تمام

جمال یار=محبوب کا حسن

دہکا ہوا= روشن

آتش گل= اس سے مراد پھولوں کا رنگ ہے۔ موسم بہار میں سرخ پھول چمن میں یوں لگتے ہیں جیسے ہر طرف آگ لگی ہوئی ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ محبوب کے حسن ورعنائی کی وجہ سے پوری کی پوری انجمن بقعہ نور بنی ہوئی ہے۔ ہر شے منور وتاباں ہے اور ہر فرد نور میں نہایا ہوا ہے۔ فضا رنگین ہے اور ماحول درخشاں ہے یہ وہ نور اور روشنی ہے جس کو دیکھ کر موسم بہار کا وہ خوب صورت اور دلآویز منظر نگاہوں کے سامنے آ گیا ہے جب پھولوں کے سرخ رنگ سے ہر طرف آگ سی لگی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ یہاں شاعر نے جمال یار کو آتش گل سے تشبیہ دی ہے جو حسن ولطافت کی آئینہ دار ہے۔

شعرنمبر 2

اللہ رے جسم یار کی خوبی کہ خود بخود
رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام

پیرہن=لباس

شاعر کہتا ہے کہ جسم محبوب کے حسن اور رنگینی کا یہ عالم ہے کہ اس کا لباس بھی رنگینوں میں ڈوب گیا ہے۔ وہ بادی النظر میں کہنا چاہتا ہے کہ یہ رنگینی لباس کی اپنی نہیں بلکہ محبوب کے جسم کی ہے۔حسرت موہانی کا یہ شعر اردوغزل کے پورے مجموعے میں ایک امتیازی درجہ رکھتا ہے۔رنگ کا یہ احساس مصحفی اور حسرت کے علاوہ شاید ہی کسی اور شاعر کے ہاں نظر آئے۔

شعرنمبر 3

دیکھو تو چشم یار کی جادو نگاہیاں
بے ہوش اک نظر میں ہوئی انجمن تمام

شاعر کہتا ہے کہ جسم محبوب کی نگاہوں میں کچھ ایسا جادو ہے کہ اس کی ایک ہی نظر نے عشاق کے مجمع کو بے ہوش کر دیا ہے۔جس شخص کو بھی اس کی مخمور نگاہوں نے دیکھا وہ بے حال ہو گیا ہے۔ ہر ایک کا صبر و قرار جا تا رہا ہے۔

واضح رہے کہ چشم کی جادو نگاہی حسرت موہانی کی اپنی ترکیب ہے اور اسے انھوں نے بڑی خوبی سے نبھایا ہے کیونکہ نگاہ کا حوالہ دیئے بغیر بے ہوشی کا تذکرہ غیر مناسب ہوتا۔

شعرنمبر 4

اچھا ہے اہل جور کیے جائیں سختیاں
پھیلے گی یوں ہی شورش حب وطن تمام

اہل جور=ظلم وستم کرنے والے۔اشارہ ہے برطانوی حکومت کی طرف

شورش=ہنگامہ

یہ ایک سیاسی شعر ہے۔مولانا حسرت موہانی جنگ آزادی کے بڑے جلیل القدر مجاہد تھے۔ان کی زندگی کا ایک بڑا حصہ جیل خانوں میں کٹا۔لیکن ان سختیوں سے مولانا کی ہمت پست نہیں ہوئی۔ان کا حوصلہ بلند تر ہوتا چلا گیا۔اس شعر میں حسرت کہتے ہیں کہ برطانوی حکومت جتنا بھی ظلم وستم کرے اور جس قدر بھی جفا سے تمتش آئے ، یہ آزادی وطن کے لیے اتنا ہی بہتر ہے کیونکہ وطن کی محبت اور آزادی کی تحریک اسی طرح پھیلے گی اور عوام میں مقبول عام ہوگی۔

شعرنمبر 5

شیرینی نسیم ہے ، سوز وگداز میر
حسرت ترے سخن پہ ہے لطفِ سخن تمام

شیرینی=مٹھاس

لطفِ سخن=شاعری کا مزا

سوز و گداز=دردمندی

زیرِ نظر غزل کے اس مقطع میں حسرت نے اپنی شاعری پر تبصرہ کیا ہے۔ واضح رہے کہ وہ ایک وسیع النظر نقاد بھی تھے۔ ان کی شاعری میں ہمیں اساتذہ کا رنگ ایک نئے انداز میں ملتا ہے۔ وہ اپنی شاعری کے بارے میں کہتے ہیں کہ میری غزل میں نسیم دہلوی کی شیرینی پائی جاتی ہے۔ حسرت نسیم کا ذکر یوں لائے ہیں کہ وہ مولانا کے استاد تسلیم کے استاد تھے۔ پھر آگے چل کر کہتے ہیں کہ میرے کلام میں میر کی دردمندی بھی ہے۔ بادی النظر میں وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ شاعری کا لطف میری غزل میں مکمل ہو گیا ہے، اس لیے کہ اس میں شیرینی بھی ہے اور سوز و گداز بھی! اور یہی دو عناصر اعلیٰ غزل کی پہچان ہیں۔

3.4 غزل نمبر 4

نگاہ ناز جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیِ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے
خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے
غمِ جہاں سے جسے ہو فراغ کی خواہش
وہ ان کے دردِ محبت سے ساز باز کرے
امیدوار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ
تری نگاہ کو اللہ دل نواز کرے
ترے کرم کا سزا وار تو نہیں حسرتؔ
اب آگے تیری خوشی ہے جو سرفراز کرے

تشریح

شعر نمبر 1

نگاہ ناز جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیِ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

نگاہ ناز=محبوبانہ نظر۔ناز وادا کی نظر

آشنائے راز کرنا=محبت کے رازوں سے باخبر کرنا

شاعر کہتا ہے کہ محبوب کی نگاہ جسے محبت کے رازوں سے باخبر کردے اور اپنی دلی کیفیت وحالت سے اسے آشنا کردے،اسے یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی قسمت کی خوبی اور یاوری پر جتنا چاہے ناز کرے۔حقیقت تو یہ ہے کہ نگاہ محبوب کا التفات عاشق صادق کے لیے معراج ہے۔

واضح رہے کہ مولانا حسرت موہانی اپنی اس غزل کو''عارفانہ رنگ سخن'' کی نمائندہ قرار دیتے تھے۔حقیقت یہ ہے کہ غزل کا لہجہ ایسا ہے جس میں مجازی عشق کی سرپرستی بھی ہے اور ساتھ ہی ساتھ حسنِ ازل کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔

شعر نمبر 2

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

خرد=عقل مند

جنوں=دیوانگی۔پاگل پن

حسن کرشمہ ساز=عشوہ گری کرنے والا حسن

شاعر کہتا ہے کہ عشق ومحبت میں انداز زیست اور سوچنے سمجھنے کے طریقے تک بدل جاتے ہیں۔دنیا والے جن باتوں کو عقل مندی قرار دیتے ہیں،وہ عاشق صادق کے نزدیک دیوانگی کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتیں۔بایں ہمہ اہل دنیا جن چیزوں کو جنون یا دیوانگی قرار دیتے ہیں،یعنی عشاق کی بے تابی،آہ وزاری،گریہ کناں رہنے کی عادت،رات بھر اختر شماری کا وتیرہ،فراق محبت میں گریباں پھاڑنے کی حرکت۔یہ ساری خصوصیات اہل عشق ومحبت کے نزدیک عقل کی علامتیں ہیں۔

حسرت موہانی گویا یہ باور کرنا چاہتے ہیں کہ محبوب کے حسن وجمال کا یہ کرشمہ ہی تو ہے کہ دنیا والوں کا نقطہ نظر تک بدل دیا گیا ہے۔یعنی جنوں کو خرد اور خرد کو جنوں کہا جانے لگا ہے۔

شعر نمبر 3

غم جہاں سے جسے ہو فراغ کی خواہش

وہ ان کے درد محبت سے ساز باز کرے

فراغ=آرام۔فرصت

ساز باز=سازش

یہاں سب سے پہلے یہ حقیقت واضح کردی جائے کہ عاشق اپنے عشق کی کیفیتوں میں زندگی کے ہر دکھ درد ہر فکر وغم اور ہر الجھن کو بھول جاتا ہے۔گویا محبوب کا عشق عشاق کے دلوں کو دونوں جہاں کے فکر وغم سے بالکل بے نیاز کردیتا ہے۔یہی

زیرِنظر شعر کا بھی بنیادی خیال ہے۔

شاعر کہتا ہے کہ جو شخص دنیا کی الجھنوں اور بکھیڑوں سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہو، اس کے لیے بس یہی صورت ہے کہ وہ غمِ محبوب کو اپنا لے اور اس کے دردِ عشق کو دل میں جگہ دے دے۔ یہاں یہ بات بھی واضح کر دی جائے تو بہتر ہے کہ لفظ ''سازباز'' اچھے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا۔ کسی کے خلاف سازش اور گٹھ جوڑ کرنا تہذیب و اخلاق کے منافی ہے لیکن حسرت موہانی نے اسی لفظ کو زیرِنظر شعر میں بہت بلند کر دیا ہے۔

شعر نمبر 4

امیدوار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ
تری نگاہ کو اللہ دل نواز کرے

گروہ = مجمع۔ جماعت۔ غول

دل نواز = دل کو تسلی دینے والا۔ مہربانی اور عنایت کرنے والا

شاعر کہتا ہے کہ عاشقوں کے گروہ ہر طرف کتنی ہی امیدوں اور آرزؤں کو اپنے دلوں میں بسائے کھڑے ہیں۔ وہ سب محبوب کے التفات کے منتظر اور اس کی عنایات کے جویا ہیں۔ خدا سے یہی دعا ہے کہ وہ تیری نگاہوں کو التفات اور دل نوازی کے آداب سکھا دے تاکہ تو اپنے عاشقوں کے ساتھ مہر و محبت سے پیش آئے۔

حسرت موہانی نے اس شعر میں عشق کا انتہائی بلند تصور پیش کیا ہے۔ نہ اس میں رقابت کا روایتی تصور ہے۔ نہ محبوب کے ستمگرانہ رویے کا اعادہ کیا گیا ہے بس یہی دعا کی گئی ہے کہ جملہ عشاق کے ساتھ وہ محبت آمیز سلوک کرے۔

شعر نمبر 5

ترے کرم کا سزا وار تو نہیں حسرتؔ
اب آگے تیری خوشی ہے جو سرفراز کرے

سزاوار ہونا = لائق ہونا

سرفراز کرے = عزت و توقیر دے۔ مرتبہ بلند کرے

شاعر اس شعر میں خدا سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ اگرچہ میں تیری عنایتوں اور کرم فرمائیوں کے لائق نہیں ہوں لیکن اب یہ بات تیری مرضی اور منشا پر منحصر ہے کہ میرا مرتبہ بلند اور درجات میں اضافہ کر دے۔ اگر ہم مجازی معنی لیں تو مطلب یہ ہوگا کہ اے محبوب! اگرچہ میں تیرے التفات و عنایت کے قابل نہیں، لیکن اگر تو مجھے سرفراز اور بامراد کر دے تو یہ تیری عنایت اور مہربانی ہے۔ حسرت کی غزل کا یہ مقطع ان کے عارفانہ رنگِ سخن کا مظہر ہے اور اس میں سلوک و معرفت کا موضوع بہت واضح ہے۔

3.5 غزل نمبر 5

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی
جو چاہے سزا دے لو تم اور بھی کھل کھیلو
پر ہم سے قسم لے لو کی ہو جو شکایت بھی
دشوار ہے رندوں پر انکار کرم یکسر
اے ساقی جاں پرور، کچھ لطف وعنایت بھی
اے شوق کی بے باکی وہ کیا تری خواہش تھی
جس پر انھیں غصہ ہے، انکار بھی، حیرت بھی
ہرچند ہے دل شیدا حیرت کامل کا
منظور دعا لیکن ہے قید محبت بھی

تشریح

شعر نمبر 1

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

مشقِ سخن = شعر گوئی کی مشق

طرفہ = انوکھا۔ عجیب

حسرت موہانی آزادی کے نڈر اور جاں باز مجاہد تھے۔ ان کی ساری زندگی اسی مطلع کی تفسیر تھی اور اس مطلع کے نزول کے پس منظر سے واقفیت ضروری ہے۔ مولانا نے 1908ء میں اپنے جریدے ''اردو معلیٰ'' میں انگریزوں کی سیاست کے خلاف ایک مضمون شائع کر دیا۔ اس کی پاداش میں انھیں تین سال کی قید با مشقت کی سزا ہوئی اور انھیں علی گڑھ ڈسٹرکٹ جیل میں رکھا گیا۔ ان کے ساتھ بہیمانہ سلوک کیا جاتا چکی چلوا کر منوں آٹا پسوایا جاتا۔ اسی زمانے میں یہ غزل جیل کی چار دیواری میں لکھی تھی۔

حسرت کہتے ہیں کہ میری طبیعت بھی کچھ عجیب اور انوکھی واقع ہوئی ہے۔ کہاں جیل کی سنگلاخ اور اونچی دیواریں، کہاں یخ بستہ فرش کہاں برطانوی حکمرانوں کا بہیمانہ سلوک، کہاں چکی پیسنے کی مشقت اور کہاں یہ مشقِ سخن! گویا ان تمام مصائب والام اور مشقت وصعوبت کے باوجود میں نے اپنی شعر گوئی کے جذبے کو برقرار رکھا اور اسے زنگ آلود نہ ہونے دیا۔

شعر نمبر 2

جو چاہے سزا دے لو تم اور بھی کھل کھیلو
پر ہم سے قسم لے لو کی ہو جو شکایت بھی

کھل کھیلنا= شرم وحیا کو بالائے طاق رکھ کر آزادانہ کوئی کام کرنا۔ پوری طرح آزاد ہو جانا۔ یہاں بے رحمانہ سلوک کرنا مراد ہے۔

شاعر انگریز حکمرانوں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ تمھارا جو جی چاہے اور جس طرح چاہے مجھے سزا دو۔تم ایسا کرنے میں آزاد ہو۔تم سے کوئی باز پرس کرنے والا نہیں اور میں بھی کسی خاص مقصد کے تحت تمھارا اسیر ہوا ہوں۔ میں شکوہ شکایت کر کے اپنے مقصد اولی کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔

یہ سراسر سیاسی شعر ہے،مگر مجازی معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ اے محبوب! تم جو چاہو سزا دو،جس طرح چاہو،ظلم و جور کرو، مگر میں اف تک نہ کروں گا۔ میری زبان پر کبھی کلمہ شکایت نہیں آئے گا۔تم اس سلسلے میں مجھ سے قسم بھی اٹھوا سکتے ہو۔

شعر نمبر 3

دشوار ہے رندوں پر انکار کرم یکسر
اے ساقی جاں پرور، کچھ لطف وعنایت بھی

انکار کرم= مہربانی کے ساتھ پیش نہ آنا۔رحم کرنے سے انکار کرنا

یکسر= سراسر۔ بالکل

جاں پرور= زندگی بخشنے والے۔ روح پرور

شاعر ساقی سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ رند تشنہ لب ہیں۔ وہ جام کے طلب گار ہیں۔تو نے انھیں اپنے لطف و کرم سے محروم رکھ کر انصاف نہیں کیا ہے تو نے مہربانی نہ کرنے کا جو ارادہ کیا ہے،وہ ان کے لیے سوہان روح ہے۔اے ساقی! تو زندگی بخشنے والا ہے تو روح پرور ہے رندوں پر تیرا انکار کرم نہایت گراں ثابت ہو رہا ہے۔لہٰذا اپنی فطرت جاں پروری کے طفیل ان تشنہ لب رندوں کو بھی کچھ عنایت مے کر دے۔ وہ بالکل ہی تشنہ کام تو نہ رہیں۔ان کی کچھ تو تسلی تشفی ہو جائے۔

شعر نمبر 4

اے شوق کی بے باکی وہ کیا تری خواہش تھی
جس پر انھیں غصہ ہے، انکار بھی، حیرت بھی

بے باکی =شوخی۔شرارت،بے خوفی۔ بے حیائی

شاعر کہتا ہے کہ جذبہ محبت میں میرا شوق اور والہانہ پن بالکل بے باک ہو گیا اور محبوب سے کچھ ایسی خواہش کر بیٹھا جس پر اسے نہ صرف غصہ آیا، بلکہ اس نے یہ تمنا پوری کرنے سے بھی انکار کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ اسے حیرت بھی ہوئی کہ

عاشق نے یہ سفلہ پنی اور بے حیائی کا رویہ کیوں اختیار کیا۔ بادی النظر میں حسرت یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ محبت ایک پاک اور معصوم جذبہ ہے۔ اس اس جنسی جذبات کی آمیزش معیوب بھی ہے اور غیر پسندیدہ بھی۔

شعر نمبر 5

ہرچند ہے دل شیدا حیرت کامل کا
منظور دعا لیکن ہے قید محبت بھی

یہ ایک سیاسی شعر ہے اور اس کا ایک تاریخی پس منظر ہے۔ طلبا کو اس سے واقف ہونا ضروری ہے۔ دسمبر 1921ء میں احمد آباد میں کانگریس کا تاریخی جلسہ تھا جس میں تحریک خلافت کے لیڈر بھی شریک تھے۔ وہاں مولانا حسرت موہانی نے آزادی کامل کی تحریک پیش کردی۔ تاہم گاندھی کی کوششوں سے یہ تجویز نامنظور کردی گئی۔ اسی سال کانگریس کے اجلاس کے ساتھ احمد آباد ہی میں آل انڈیا مسلم لیگ کا بھی سالانہ اجلاس مولانا حسرت موہانی کی زیر صدارت ہوا۔ اپنے صدارتی خطبے میں انھوں نے وہی خیالات پیش کیے جو کانگریس کے جلسے میں پیش کر چکے تھے یعنی آزادی کامل! یہ خطبہ صدارت ضبط ہوا اور مولانا کو دو سال کے لیے سزائے قید ملی۔ اس شعر میں حریت کامل کا اعلان اور سزائے قید دونوں کو غزل کے پیرائے میں واضح کیا گیا ہے۔

4۔ خود آزمائی

1۔ حسرت موہانی کی غزل نے جدید غزل کو جن رجحانات سے آشنا کیا ہے، ان پر روشنی ڈالیے۔

2۔ حسرت کی شاعری قدیم و جدید رنگ کا دل آویز عکس ہے۔ اس کلیے سے بحث کیجیے۔

3۔ حسرت کی غزل ''مشق سخن'' اور ''چکی کی مشقت'' دونوں کی آئینہ دار ہے۔ وضاحت کیجیے۔

4۔ حسرت موہانی کی شاعری میں ایک سیاسی مجاہد کا پرتو پایا جاتا ہے۔ ان کے کلام کی روشنی میں اس بیان کا تجزیہ کیجیے۔

5۔ 'طبع حسرت نے اٹھایا ہے ہر استاد سے فیض' اس مصرع کی روشنی میں حسرت کے قول کی تائید یا تردید کیجیے۔

6۔ حسرت کو رئیس المتغزلین کیوں کہا جاتا ہے؟

7۔ حسرت کے فن میں لہجے کی بڑی رنگارنگی اور بوقلمونی ملتی ہے۔ اس قول کی صداقت پر روشنی ڈالیے۔

5۔ مجوزہ کتب برائے مطالعہ

1۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں، حسرت کی شاعری، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دلی، 1983ء

2۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، ولی سے اقبال تک، چمن بک ڈپو، دلی، 1985ء

3۔ جلیل قدوائی، (مرتب)، انتخاب کلام حسرت، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دلی، س ن

4۔ ایم حبیب خان، حسرت موہانی، ساہتیہ اکیڈمی، 1984ء

5۔ کلیم الدین احمد، اردو شاعری پر ایک نظر، بک ایمپوریم پٹنہ، 1985ء

6۔ فراق گورکھپوری، اندازے، ادارہ فروغ اردو، لاہور، 1956ء

7۔ رسالہ آج کل، حسرت موہانی نمبر، دلی، 1952ء

یونٹ نمبر 8

غزلیات فراق

تحریر: ڈاکٹر محمد قاسم
نظر ثانی: پروفیسر ڈاکٹر محمد کامران

فہرست

یونٹ کا تعارف

عزیز طلبہ و طالبات

اس یونٹ میں آپ فراق گورکھپوری کے حالات زندگی اور ان کی منتخب غزلیات کا مطالعہ کریں گے۔ فراق کا شمار بیسویں صدی کے ان نمائندہ شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو غزل کو ایک نئی شناخت نئی پہچان عطا کی۔ فراق نے غزل کے مخصوص اور روایتی موضوعات کو اپنے طرز احساس اور جمالیاتی شعور کی بنا پر نہ صرف وسیع کیا بلکہ ان میں اک نئی معنویت بھی پیدا کی۔ اردو کے کلاسیکی شعرا، انگریزی ادب، اس کے رومانوی شعرا سے دل بستگی اور سنسکرت ادب کے گہرے مطالعہ کے باوصف فراق کے ہاں ایک ایسی خلاقانہ بصیرت دکھائی دیتی ہے جس نے ایک نئی آواز ایک نئے لہجے کو جنم دیا جو ماقبل اردو غزل کی روایت میں کم یاب دکھائی دیتا ہے۔

میں نے اس آواز کو مرمر کے پالا ہے فراق
آج جس کی نرم لو ہے شمع محراب حیات

یونٹ کے مقاصد

امید ہے کہ اس یونٹ کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہوسکیں گے کہ:

1۔ ایک غزل گو کی حیثیت سے فراق کے مقام کو پہچان سکیں۔
2۔ فراق کے حالات زندگی بیان کرسکیں۔
3۔ یہ جان سکیں کہ فراق نے اردو غزل کے مخصوص موضوعات کو کس طرح وسیع کیا اور ان میں نئی معنویت پیدا کی۔
4۔ فراق کی غزلیات کو سمجھ کر ان کی شرح کرسکیں۔

1۔ فراق گورکھپوری

(1896ء۔1982ء)

1.1 سوانح

فراق گورکھپوری 28 اگست 1896 کو اتر پردیش کے ضلع گورکھپور میں پیدا ہوئے۔ اسی نسبت سے انہیں فراق گورکھپوری کہا جاتا ہے۔ فراق گورکھپوری کا پورا نام رگھو پتی سہائے تھا۔ وہ کائستھ تھے۔ کائستھ ان ہندوؤں کو کہا جاتا ہے جو راجاؤں کے ہاں دستاویزات کی کتابت کیا کرتے تھے۔ فراق کے والد کا نام گورکھ پرشاد تھا جو خود ایک شاعر تھے اور عبرت تخلص کرتے تھے۔ وہ زمیندار تھے اور وکالت بھی کرتے تھے۔ وہ حالی اور آزاد کے ہم عصر تھے۔ گورکھ پرشاد عبرت کا واحد دستیاب کلام ان کی مثنوی "حُسنِ فطرت" ہے جسے مجنوں گورکھپوری نے شائع کیا۔ فراق کا بچپن قدرے آسودگی میں گزرا۔ ان کا گھرانہ معاشی طور پر مستحکم تھا۔ بچپن میں مناظرِ فطرت انہیں بہت متاثر کرتے تھے۔ بچپن ہی سے وہ لوک موسیقی کا بھی شوق رکھتے تھے۔ فراق نے ابتدائی تعلیم مقامی مشن سکول سے حاصل کی۔ 1915 میں انھوں نے ایف اے کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ سنٹرل کالج الہ آباد سے انھوں نے بی اے کیا۔ 1930 میں انھوں نے آگرہ یونیورسٹی سے ایم اے انگریزی کا امتحان ایک پرائیویٹ طالبِ علم کے طور پر درجہِ اول میں امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس کیا اور الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کے استاد مقرر ہوئے۔ وہ انڈین سول سروس میں بھی منتخب ہوئے لیکن تحریک آزادی اور کانگریس میں شمولیت کی وجہ سے انڈین سول سروس کو خیر باد کہہ دیا۔ کچھ عرصہ جواہر لال نہرو کے ساتھ کام کیا اور جیل بھی کاٹی۔ الہ آباد یونیورسٹی میں استاد ہونے کے بعد مستقلاً اسی ادارے سے وابستہ رہے اور 1959 میں ریٹائرڈ ہوئے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں فراق کی شادی کشوری دیوی سے ہوئی۔ فراق کے نزدیک یہ شادی ان کے لیے ایک حادثہ تھی۔ فراق اپنے زمانے میں ایک معتبر اور مستند شاعر کے طور پر پہچانے جاتے تھے تاہم ان کی خانگی زندگی مسائل کا شکار رہی۔ ان کا انتقال 3 مارچ 1982 میں دل کا دورہ پڑنے سے ہوا۔ بوقت انتقال وہ دلی میں تھے۔ ان کی میت کو دلی سے الہ آباد لایا گیا اور دریائے گنگا جمنا کے سنگم پر نذرِ آتش کر دیا گیا۔

فراق نے پندرہ سال کی عمر میں ہی شاعری کا آغاز کر دیا تھا۔ چونکہ ان کے والد شاعر تھے اس لیے ان کے گھر شعروشاعری کی نشستیں منعقد ہوتی تھیں۔ یہ محافل فراق کے شعری رجحان کی پرداخت کے لیے بہت سودمند ثابت ہوئیں۔ بیس برس کی عمر میں فراق نے پہلی غزل لکھی۔ اس وقت وہ بی اے کے طالبِ علم تھے۔ بیس برس کی عمر میں شروع ہونے والا یہ سلسلہ تادیر جاری رہا جس کے نتیجے میں آج فراق کو اردو غزل کا نمائندہ شاعر متصور کیا جاتا ہے۔ وہ انگریزی کے استاد تھے تاہم اردو زبان سے ان کی محبت ان کی اردو علمی وادبی تصانیف کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ وہ اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ منفرد نقاد بھی تھے۔ ان کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہوئے جن میں روحِ کائنات، رمز و کنایات، غزلستان، شبنمستاں، گل ونغمہ اور روپ شامل ہیں۔ فراق کو ان کی خدمات کے صلے میں کئی ایوارڈ ملے۔ 1962ء میں انھیں ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ سے نوازا

گیا۔حکومتِ ہندوستان کی طرف سے انھیں پدم بھوشن ایواڈ دیا گیا۔انہیں ہندوستانی ادبیات کا سب سے بڑا اعزاز گیان پیٹھ ایوارڈ بھی پیش کیا گیا۔علاوہ ازیں انہوں نے غالب ایوارڈ بھی حاصل کیا۔

فراق کا شمار بیسویں صدی کے ان شعرا میں ہوتا ہے جنہوں نے اردو غزل کی شناخت کو برقرار رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔غزل کے حوالے سے فراق کو جو شہرت اور مقبولیت نصیب ہوئی وہ بہت کم شعرا کے حصے میں آتی ہے۔فراق اقبال، فیض، یگانہ چنگیزی، جگر مرادآبادی، ساحرلدھیانوی اور جوش ملیح آبادی کے ہم عصر ہیں۔ان بڑے شعرا کی کہکشاں میں فراق ایک روشن ستارے کی طرح نظر آتے ہیں۔فراق ایک رجحان ساز شاعر ہیں اور انہوں نے غزل میں منفرد رجحانات ومیلانات متعارف کروائے ہیں۔تخلیقی سطح پر فراق کی غزل عصری ماحول کے تابع نہیں۔فراق کی غزل کی یہ آزادی کئی سطحوں پر محسوس کی جاسکتی ہے مثلاً زبان و بیان، لہجہ، اسلوب، آہنگ، بے ساختگی اور وہ مخصوص فضا اور جمالیاتی طرزِ احساس جو معاصرین و ماقبل شعرا کے ہاں دکھائی نہیں دیتا۔

1.2 حسن وعشق کی بدلی ہوئی کیفیات کا بیان

فراق کی شاعری کے موضوعات غزل کے روایتی اور مخصوص موضوعات ہی ہیں لیکن فراق نے اپنے طرز احساس اور جمالیاتی شعور کی بنا پر ان موضوعات کی حدود کو وسیع بھی کیا اور ان میں نئی معنویت بھی پیدا کی۔فراق سے پہلے غزل کا لہجہ ایسا دھیما اور نرم نہ تھا۔فراق کے ہاں عشق بلکہ حسن وعشق کی بدلی ہوئی کیفیات کا شعور ملتا ہے جس کی نہاد میں اردو وانگریزی روایات اور ہندوستانی ثقافت وتہذیب سے استفادے کی صورت دکھائی دیتی ہے۔جزئیات ومتعلقات عشق کی کہانی کو فراق نے سورنگوں سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔عشق کی نفسیات، عاشق اور معشوق کی حیثیت، تنہائی ووصل کے معاملات کے تناظر میں دیکھیں تو ایک بدلی ہوئی دنیا سے ہمارا سامنا ہوتا ہے۔

مدتیں گزریں تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں
تھی یوں تو شام ہجر مگر پچھلی رات کو
وہ درد اٹھا فراق کہ میں مسکرا دیا
کسی کا یوں تو ہوا کون عمر بھر پھر بھی
یہ حسن وعشق تو دھوکا ہے سب مگر پھر بھی
مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست
آہ اب مجھ سے تری رنجش بے جا بھی نہیں
مائل بے داد وہ کب تھا فراق
تو نے اس کو غور سے دیکھا ہی نہیں

ان تمام اشعار میں بدلی ہوئی کیفیات سے واسطہ پڑتا ہے۔ اردو غزل کے روایتی موضوعات ہوتے ہوئے بھی معنوی سطح پر ایک نئی دنیا، ایک نیا جہان دکھائی دیتا ہے۔ یہی بدلی ہوئی عشقیہ کیفیات اور غیر قطعیت فراق کی آواز کو انفرادیت بخشتی ہیں۔ مدتوں یاد نہ آنے پر بھی نہ بھولنا، ہجر کی رات میں درد پر مسکرا اٹھنا، مائل بیداد کے تناظر میں غور سے نہ دیکھنے کی بات، مہربانی ومحبت کے مابین امتیاز اور حسن وعشق کو دھوکا سمجھتے ہوئے پھر بھی اس کی جانب رغبت۔ یہ تمام رویے اور زاویے غزل کی روایتی اور طے شدہ سے مضامین سے بہت الگ محسوس ہوتے ہیں۔ معاملات ومتعلقات حسن وعشق کی تفسیر میں یہ بدلاؤ اور غیر حتمی رویہ فراق کی غزل کی امتیازی شناخت ہے۔

1.3 فراق کی شاعری میں عاشق کا کردار

فراق کی شاعری کے موضوعات میں عشق ایک اہم موضوع ہے۔ وہ عشقیہ شاعری کی روایت سے واقف تھے۔ اس موضوع پر ان کے بہت سے مضامین بھی شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی شاعری میں محبت ایک بڑا حوالہ ہے تاہم ان کے ہاں محبت محض ایک روحانی تجربے سے بڑھ کر ہے۔ وہ محبت کو بنیادی طور پر ایک جسمانی خواہش تسلیم کرتے ہیں۔ اس کے باوجود فراق اس حقیقت سے کماحقہ واقف ہیں کہ دیگر جانداروں کے برعکس انسان کے ہاں محبت ایک جسمانی فعل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دماغی فعل بھی ہے اور اس کا مقصد فقط جسمانی اختلاط نہیں ہے:

ترا وصال بڑی چیز ہے مگر اے دوست
وصال کو مری دنیائے آرزو نہ بنا

فراق کا محبوب روایتی محبوب نہیں بلکہ نفسیاتی سطح پر پُر پیچ گہرائیوں کا حامل کردار ہے۔ اسی طرح فراق کے ہاں عاشق کا کردار بھی روایت سے ہٹ کر ہے۔ ان کے ہاں عاشق خوددار ہے، وضع دار ہے، عزتِ نفس کی پاسداری کرنے والا ہے۔ بے شک عشق اس کا فعلِ کل ہے لیکن وہ عشق کے اس فعل میں اپنی نفی نہیں ہونے دیتا۔ وہ محبوب کو نہ ہی کسی اور کو اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ اس کی ذات کی نفی کی جائے۔ فراق کی شاعری میں ابھرتے ہوئے عاشق کے بارے میں محمد حسن عسکری لکھتے ہیں:

> "فراق صاحب نے اردو شاعری کو ایک بالکل نیا عاشق دیا ہے اور اسی طرح بالکل نیا معشوق بھی۔ اس نئے عاشق کی ایک بڑی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اندر ایک ایسا وقار پایا جاتا ہے جو اردو شاعری میں پہلے نظر نہیں آتا۔"
> (فراق کی شاعری میں عاشق کا کردار، مشمولہ: مجموعہ محمد حسن عسکری، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ص:۱۰۲۱)

اس رائے کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ماقبل فراق اردو شاعری میں عاشق کا کردار مجہول رہا ہے، عاشق تابع ہے، سپردگی نمایاں ہے، وارفتگی بدرجہ اتم ہے، جنوں کی کیفیت ہے۔ لیکن فراق کے ہاں صورتِ حال برعکس ہے۔ عاشق

محبوب کی وساطت سے نہیں پہچانا جاتا بلکہ اس کی اپنی الگ شخصیت ہے۔ فراق کے ہاں عاشق دیوانگی سے زیادہ فرزانگی کا حامل ہے۔ عاشق کی یہ فرزانگی محبوب کو دام میں لینے کے لیے استعمال نہیں ہوتی بلکہ عاشق کا شعور اس کی ذات کی تطہیر میں ممدو معاون نظر آتا ہے۔ عاشق اپنی ذہانت، فہم، ادراک اور عقل وشعور کو استعمال کرتے ہوئے عشق میں ابتذال اور سوقیانہ پن سے بچنے کی سعی کرتا ہے اور محبت میں ذہنی گراوٹ اور پستی سے اجتناب کرتا ہے۔ دوسری جانب فراق کے ہاں محبوب کی تصویر بھی روایت سے ہٹ کر ہے۔ فراق کا محبوب بھی نہیں چاہتا کہ اس کا عاشق اس کے قدموں میں بچھا رہے۔ محبوب کو بھی عاشقِ پروقار پہ ناز ہے۔ فراق کے عاشق ومعشوق اپنے کردار، اپنے صفات میں کس طرح بدلے ہوئے دکھائی دیتے ان کا اندازہ ذیل کے اشعار سے ہوگا۔

یونہی سا تھا کوئی جس نے مجھے مٹا ڈالا
نہ کوئی نور کا پتلا نہ کوئی زہرہ جبیں

ہزار شکر کہ مایوس کر دیا تم نے
یہ اور بات کہ تجھ سے بڑی امیدیں تھیں

غرض کہ کاٹ دیے زندگی کے دن اے دوست
وہ تیری یاد میں ہوں یا تجھے بھلانے میں

تم مخاطب بھی ہو قریب بھی ہو
تم کو دیکھیں کہ تم سے بات کریں

ہم سے کیا ہو سکا محبت میں
تم نے تو خیر بے وفائی کی

بہت دنوں میں محبت کو یہ ہوا معلوم
جو تیرے ہجر میں گزری وہ رات رات ہوئی

ان تمام اشعار میں عشقیہ زندگی کی اقدار غزل کی روایتی اقدار سے منحرف نظر آتی ہیں۔ معاملات محبت میں عاشق اور محبوب کی طے شدہ صفات اور کردار کے برعکس عشق کی نفسیات کی باریکیوں اور نازک پہلوؤں کی جانب اشارہ ملتا ہے۔ عاشق ومعشوق کے کرداروں کا غیر متعین رویہ ان اشعار میں صاف دکھائی دیتا ہے۔

1.4 انگریزی رومانوی شعرا کے اثرات

اگرچہ فراق کے ہاں شعری روایت میں عشق کے حوالے سے خوب صورت اشعار جا بجا مل جاتے ہیں تاہم ترقی

پسند تحریک نے فراق کے تصورِ عشق کو نئی جہات سے آشنا کیا۔فراق نے جب شاعری کا آغاز کیا تو تو علی گڑھ کی عقلیت پسندی کے ردِعمل کے طور پر رومانی تحریک جنم لے چکی تھی اور عالمی سیاسی منظر نامہ ہندوستان میں بھی ترقی پسند تحریک کے لے راستہ ہموار کر رہا تھا۔اس صورت حال نے فراق کی فکری جہات کو بھی متاثر کیا۔ پھر فراق چونکہ انگریزی ادب شناس بھی تھے اس لیے انہوں نے انگریزی شاعری سے بھی فیض اٹھایا۔ انگریزی ادب کا عکس ان کے مضامین کے علاوہ ان کے اسلوب میں بھی نظر آتا ہے۔مثال کے طور پر فراق کے ہاں ورڈز ورتھ کی شاعری کا عکس دیکھا جا سکتا ہے۔ ورڈز ورتھ فطرت کا دلدادہ تھا۔اس کی فطرت کا رنگ اور رومانوی لہجہ فراق کی شاعری میں بھی نظر آتا ہے:

بہت آہستہ اُٹھتی ہے نگاہ شاعر فطرت
رخ ہستی سے چادر سی مگر سرکا ہی جاتی ہے

فراق کی شاعری پر ورڈز ورتھ کے اثرات کے ضمن میں نقی حسین جعفری لکھتے ہیں:

"فراق نے ورڈز ورتھ سے خصوصی طور پر اور انگریزی رومانی تحریک سے عمومی طور پر جو اثر قبول کیا وہ ان کے چند اشعار اور نظموں کے مرکزی خیال تک محدود نظر نہیں آتا بلکہ ان کے پورے شعری رویہ پر حاوی ہے۔فطرت کا قرب اور اس کی پر اسراریت (رات اور پچھلے پہر کے مختلف پیکر اور ان کی تفسیریں اسی رومانی رویہ کا پتا دیتی ہیں)، دھندلکا، مانوس اشیاء کا حسن اور ان کی ندرت اور ایک طرح کی "محویت" جو حیرت و استعجاب، سرخوشی اور بصیرت سے عبارت ہے،فراق کی شاعری میں نظر آتی ہے۔"

(فراق اور انگریزی روایت،مشمولہ: فراق شاعر اور شخص (مرتب: شمیم حنفی)، بک ٹریڈرز، لاہور۔ص:۱۰۹)

ورڈز ورتھ ہی نہیں بلکہ فراق نے شیلے، کیٹس، ولیم بلیک، گرے جیسے شہرہ آفاق شعرا سے بھی اکتساب کیا۔ انگریزی ادب کے اثرات کے علاوہ فراق کی شاعری میں ہندی تہذیب کے نقوش بھی پختہ ملتے ہیں۔فراق نے ہندی تہذیبی عناصر کو بھی اپنی شاعری کا حصہ بنایا۔ان کی نظموں اور رباعیات میں بالخصوص ہندی دیو مالا سے استفادہ کیا گیا ہے۔ان کے شعری قالب کی تعمیر میں سنسکرت کی شعری روایات کی کارفرمائی موجود ہے تاہم اسے فراق کی شاعری کا انفرادی پہلو قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ دیگر کئی اردو شعرا کے ہاں ہندوی تہذیب کے نقوش فرداً فرداً نظر آتے ہیں۔البتہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ہندو دھرم میں عشق کے کرشنائی روپ کا تکلم اور مخصوص لب و لہجہ فراق کی وساطت سے اردو شاعری میں تخلیقی سطح پر از سرِ نو دریافت ہوا ہے۔ یہاں تک ہی محدود نہیں بلکہ فراق کے غزل کے چند مقامات پر اسلامی تہذیب بھی ہندوی تہذیب کے دوش بدوش نظر آتی ہے:

سکوت توڑ کہ قم کی صدا ہے تیری صدا
نظر اٹھا کہ ان آنکھوں کا رس ہے سنجیون

انگریزی اور ہندوی دو بالکل مختلف تہذیبی روایتوں کے نقوش سے اردو شاعری کو آراستہ کرنے والے فراق کی شاعری پہلودار ہے۔ اس میں روایت بھی ہے اور جدت بھی۔ اردو کلاسیک کے ساتھ ہندوستانی تہذیب اور انگریزی ادب کے گہرے مطالعے نے فراق کو فکر و خیال کی ایک ایسی تخلیقی دنیا میں پہنچا دیا جہاں زندگی کے معاملات کا گہرا شعور ملتا ہے۔ فراق کا المیہ ان کے اپنے عہد کے دکھ سکھ میں شریک ہو کر ان کی غزل کے فکری لہجے میں ایسی جگہ پاتا ہے جہاں صرف اظہار نہیں ہے بلکہ تجزیہ ہے فکر و فلسفہ ہے۔ فراق کے اشعار کو صرف لب و رخسار کی شاعری نہیں کہا جا سکتا۔ ان میں عاشقانہ جذبے کے ساتھ عصریت اور ابدیت کے بعض ایسے عناصر جھلکتے نظر آئیں گے جو فراق کی گہری سوچ اور فکر کا حصہ ہیں۔

موت کا بھی علاج ہے لیکن
زندگی کا کوئی علاج نہیں

زندگی کیا ہے آج اسے اے دوست
سوچ لیں اور اداس ہو جائیں

1.5 محاسن کلام

فراق کی شاعری میں تشبیہات کی سطح پر ایک تازگی اور نیا پن موجود ہے۔ ان اچھوتی اور نادر تشبیہات کے پس منظر میں فراق کے خلاقانہ جوہر کے ساتھ ساتھ ہندی شاعری سے استفادے کی صورت بھی دکھائی دیتی ہے۔ وہ شعر کے باطنی مفہوم اور ظاہری پیکر دونوں کی دل کشی کے قائل ہیں۔ ان کی تشبیہات میں تصنع اور بناوٹ محسوس نہیں ہوتی۔ یہ تشبیہات جمالیاتی سطح پر اپنے اندر خوب صورتی کا ایک جہان آباد کیے ہوئے ہیں اور ان تشبیہات کی فضا اور کیفیت کی بدولت اردو شاعری کا کینوس وسیع ہوتا معلوم ہوتا ہے۔ ان تشبیہات میں کہیں کہیں استعارے کی جھلک بھی نمایاں ہو جاتی ہے۔

دلوں کو تیرے تبسم کی یاد یوں آئی
کہ جگمگا اٹھیں جس طرح مندروں میں چراغ

پچھلی شب نگہ نرگس خمار آلود
کہ جیسے نیند میں ڈوبی ہوئی ہو چندر کرن

تو ایک تھا مرے اشعار میں ہزار ہوا
اس اک چراغ سے کتنے چراغ جل اٹھے

خیال گیسوئے جاناں کی وسعتیں مت پوچھ
کہ جیسے پھیلتا جاتا ہو شام کا سایہ

دل دکھے روئے ہیں شاید اس جگہ اے کوئے دوست
خاک کا اتنا چمک جانا ذرا دشوار تھا

محبوب کے تبسم سے چراغوں کا جگمگا اٹھنا، نرگس خمار آلود سے نیند میں ڈوبی چاند کی کرنوں کا تذکرہ، خیال یار سے ہزاروں چراغوں کا جل اٹھنا اور دل دکھوں کے رونے پر خاک کا چمک جانا، جہاں فراق کی نادر تشبیہات کی جانب توجہ دلاتے ہیں وہیں متحرک امیجز اور پیکر تراشی کی صورت احساس سماعت و بصارت کے لیے مہمیز کا کام کرتی ہیں۔ یہ تشبیہات غزل کی مروجہ روایت سے بہت حد تک مختلف ہیں۔ ان تشبیہات میں فراق کے ذاتی مشاہدے اور مطالعے کی کارفرمائی بہت نمایاں ہے۔

فراق کو ادراک تھا کہ وہ اپنے عہد کے معتبر شاعر ہیں۔ انہیں اپنے فن پر یقین تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ بیسویں صدی کے ان شعرا میں شمار ہوتے ہیں جن کی کاوش سے شاعری کا آئندہ منظر نامہ متشکل ہوگا۔ وہ اپنی غزلوں کی تاثیر اور قوتِ تسخیر کے قائل تھے۔ فراق کے اسی ادراک کی بدولت ان کے ہاں شاعرانہ تعلیٰ ملاحظہ ہو:

آنے والی نسلیں تم پر فخر کریں گی ہم عصرو
ان کو جب دھیان آئے گا تم نے فراق کو دیکھا تھا

فراق کے اس دعوے کے باوجود ان کی شعری عظمت کے تعین کے حوالے سے اہلِ نقد و نظر میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اگر ایک طرف نیاز فتح پوری، احتشام حسین، مجنوں گورکھپوری، حسن عسکری وغیرہم فراق کو بڑا شاعر تسلیم کرتے ہیں اور انھیں اردو کا آخری کلاسیکی شاعر قرار دے کر مناسب مقام سے نوازتے ہیں تو دوسری طرف جدید نقاد بالخصوص شمس الرحمٰن فاروقی فراق کو احمد مشتاق، ناصر کاظمی سے چھوٹا شاعر ثابت کر کے انہیں اس مسند پر بٹھانے میں متامل ہیں جس پر فراق بہرحال براجمان ہیں۔ فراق بلاشبہ ایک رجحان ساز شاعر ہیں اور اپنی شاعری کی مخصوص کیف آگیں خواب آور فضا، جمالیاتی طرز احساس اور لب و لہجے کی نرمی اور مٹھاس کی بنا پر اردو غزل کی تاریخ میں ایک امتیازی شناخت رکھتے ہیں۔

2۔ اہم نکات

1۔ فراق نے اردو غزل کو ایک نئی شناخت دی۔

2۔ فراق کی شاعری میں اردو، انگریزی اور سنسکرت روایات سے خلاقانہ استفادے کی صورت نظر آتی ہے۔

3۔ فراق کے ہاں روایتی موضوعات کے بیان میں ایک نیا ذائقہ ملتا ہے۔

4۔ فراق کی شعری کائنات میں حسن و عشق کی کیفیات غیر قطعی ہیں۔

5۔ فراق کی غزل کا لہجہ ایسا منفعل اور دھیما ہے جس کی مثال ماقبل اردو غزل میں نہیں ملتی۔

6۔ فراق کی تشبیہات روایتی نہیں بلکہ ذاتی مطالعے و مشاہدے کی دین ہیں۔

3۔ تشریحات

3.1۔ غزل:1

کسی کا یوں تو ہوا کون عمر بھر پھر بھی
یہ حسن و عشق تو دھوکا ہے سب مگر پھر بھی
ہزار بار زمانہ ادھر سے گزرا ہے
نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہ گزر پھر بھی
لپٹ گیا ترا دیوانہ گرچہ منزل سے
اڑی اڑی سی ہے یہ خاک رہ گزر پھر بھی
تری نگاہ سے بچنے میں عمر گزری ہے
اتر گیا رگ جاں میں یہ نیشتر پھر بھی
اگرچہ بے خودی عشق کو زمانہ ہوا
فراق کرتی رہی کام وہ نظر پھر بھی

شعر:1

کسی کا یوں تو ہوا کون عمر بھر پھر بھی
یہ حسن و عشق تو دھوکا ہے سب مگر پھر بھی

شاعر کو اس حقیقت کا بخوبی ادراک ہے کہ عمر بھر کوئی کسی کا نہیں رہتا، وقت کے ساتھ ساتھ وفاؤں کی شدت میں کمی آنے لگتی ہے، محبت کے چڑھتے دریا اتر جاتے ہیں، جذبات کے طوفان تھم جاتے ہیں لیکن ان تمام باتوں کے باوجود شاعر بحرِ الفت میں غوطہ زن ہے۔

"پھر بھی" کے الفاظ سے شاعر کے دل میں مچلتی اس خواہش کا نشان ملتا ہے جو بہر صورت تکمیل چاہتی ہے، جسے اس بات سے غرض نہیں کہ آگے چل کر کیا ہوگا، ہاں فی الوقت دل کی تسلی لازم ہے۔ شاعر سب جانے بوجھتے بھی دامِ فریب میں آنے کا متمنی ہے۔ اسے علم ہے کہ حسن و عشق کی حقیقت کچھ بھی نہیں اور یہ فانی ہیں، حسن نے آخر ڈھل جانا ہے۔ یہ حقیقت تو صریح ہے اور اس سے مفر نہیں کہ جوانی اور حسن سے کا دریا ہیں کہ جس نے ٹھہرنا نہیں، گزر جانا ہے۔ ان تمام حقائق کو جاننے کے باوجود شاعر اس دل کا کیا کرے جو کسی حقیقت کو نہیں مانتا، جو بہر حال یہ بازی کھیلنا چاہتا ہے، حسن و عشق کی کشش اسے اپنی جانب کھینچ رہی ہے اور وہ سب جانتے بوجھتے اس سحر کا شکار ہوتا چلا جا رہا ہے۔ شاید بے بسی ہے، شاید تمنا سرگرداں ہے، جنوں ہے، سودا ہے جو شاعر کو "پھر بھی" آتشِ شوق میں جلنے پر اکسا رہا ہے۔ ایسے میں شاعر عقلی توجیہات ماننے کے باوجود بھی

دل کے ہاتھوں بے بس ہے، بے اختیار ہے۔اور یہ بے بسی یہ دھوکہ یہ فریب صرف شاعر کے حصے میں ہی نہیں آتا بلکہ یہ تو معمولاتِ زمانہ میں سے ہے سو اس بات سے بھی حسن وعشق کی فریب خوردگی کو شہہ ملتی ہے کہ چلو جہاں سب یہ دھوکہ کھا رہے ہیں وہاں شاعر بھی اسیرِ حسن وعشق ہو رہا ہے تو کیا قباحت ہے۔

شعر:2

ہزار بار زمانہ ادھر سے گزرا ہے
نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہ گزر پھر بھی

محبوب کی گلی فقط شاعر کی راہِ شوق ہی نہیں بلکہ اس گلی میں عشاق کا آنا جانا معمول ہے۔محبوب کی ہستی میں کچھ ایسی عجیب کشش ہے کہ لوگ دیوانہ وار اس کی اور کھنچے چلے جاتے ہیں۔جس طرح نیاز مند اپنی نیاز لے کر اپنے مقامِ محبوب کی طرف رواں ہیں، جس طرح حاجت مند اپنی مراد پانے کو اپنے اپنے عقیدے کے مطابق خانقاہوں، مندروں کا رخ کرتے ہیں عین اسی طرح محبوب کے بیمار اس کے کوچے کو چل پڑتے ہیں۔ان سوختہ جگروں کا مرہم کوچ جاناں کے لمس میں ہی رکھا ہے۔ان کے پاؤں اس راستے پر پڑتے ہیں تو آبلہ پائی کا احساس کم ہونے لگتا ہے، کسک تسکین میں بدل جاتی ہے۔محبوب کی گلی میں جانے کیا بات ہے کہ اس قدر مصرف کے باوجود اس کی شان میں کمی کی بجائے اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ہر بار جانے پر بھی شاعر کو یہ راستہ نیا، انوکھا اور خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔شاید ہر بار شاعر خود ایک نئے جذبے کے ساتھ کوچہ یار کی زیارت کرتا ہے اس لیے اسے اس مقام میں نیا پن ملتا ہے کیونکہ اس کے دیکھنے کا زاویہ ہی ہر بار نیا ہوتا ہے۔شاید اس گلی سے وابستہ کئی پہلو ہیں جن کو محسوس کرنے کے لیے ایک عمر درکار ہے اور ہر پھیرے پر شاعر پر ایک نیا پہلو آشکار ہوتا ہے۔کچھ تو ایسی بات ہے کہ شاعر کو ہر بار محبوب کی رہگزر نئی سی معلوم ہوتی ہے، شاید یہ محبوب کی نسبت کا کمال ہے، شاید یہ شاعر کی نظر کا اعجاز ہے کہ وہ ہر بار دید کے نئے زاویے تلاش کر لیتی ہے۔

شعر:3

لپٹ گیا ترا دیوانہ گرچہ منزل سے
اڑی اڑی سی ہے یہ خاک رہ گزر پھر بھی

شاعر اپنی تمام طاقت صرف کر کے منزل کو پالیتا ہے لیکن منزل پہ پہنچتے پہنچتے وہ اپنا آپ راستے میں ہی صرف کر آتا ہے۔شاعر کو اپنی بقا کے لیے منزل درکار تھی لیکن بقا کے اس سفر میں وہ فنا ہو گیا ہے۔وہ اتنی شدت سے منزل کی طرف لپکا ہے کہ راستے کی دھول اس کے قدموں کی شدت سے دور تک اڑتی چلی گئی یہاں تک کہ وہ منزل تک آن پہنچا لیکن دھول ابھی بھی اڑ رہی ہے۔شاعر کی ساری بے چینی، بے قراری، صعوبت، شدت کو اس رہگزر نے محسوس کیا ہے جس پر سفر کر کے وہ منزل تک پہنچا ہے۔اس راستے کی خاک نے شاعر کے قدموں کی شدت میں پنہاں شوقِ سفر کو اس طرح محسوس کیا ہے کہ شاعر کا جنوں خود خاک میں شامل ہو گیا ہے اور یہی جنوں ہے جو اب اس خاک کو بے چین کیے ہوئے ہے۔راستے کی دھول

اس جنوں کے ہاتھوں اڑا اڑ کے اپنی بے چینی کا اظہار کر رہی ہے۔شاعر یہ جنوں سپر دِراہ کر کے منزل سے لپٹ جا تا ہے اور منزل میں اس کے لیے اس قدر تسکین ہے کہ اب اسے اپنے اس جوشِ سفر کی شدت کا اندازہ بھی جا تا رہتا ہے جو وہ راستے کے حوالے کر آیا ہے، اسی لیے تو وہ کمال معصومیت سے اڑتی خاک پہ حیران نظر آتا ہے۔فراق نے کمال دیوانگی اور جنون ووحشت کی عمدہ مرقع کشی کی ہے۔یعنی منزل کے حصول کے لیے دیوانگی شرط ہے اور یہ دیوانگی بغیر عشق کے حاصل ہو ہی نہیں سکتی۔ فراق نیا سی مضمون کو ایک اور شعر میں یوں باندھا ہے:

کمی نہ کی تیرے وحشی نے خاک اڑانے میں
جنوں کا نام اچھلتا رہا زمانے میں

شعر:4

تری نگاہ سے بچنے میں عمر گزری ہے
اتر گیا رگ جاں میں یہ نیشتر پھر بھی

نیشتر: تیر

محبوب کی نظر بہت کاری ہے اور اس کی نظروں کے وار سہنا آسان نہیں۔شاعر تمام عمر اسی کوشش میں گزار دیتا ہے کہ محبوب کی نظروں کا شکار نہ ہو لیکن وائے قسمت، تمام تر کوششیں بے کار ٹھہرتی ہیں۔اتنی احتیاط کے باوجود بھی نظر اپنا کام کر جاتی ہے اور کام بھی ایسا کہ جو جان لیوا ہو۔محبوب کی نظر کسی تیر کی مانند شاعر کی شہ رگ میں تر از و ہے اور کمال یہ کہ شاعر عمر بھر اس گھاؤ بچنے کے داؤ کھیلتا رہا اور جب شکار ہوا تو یوں کہ جیسے خود ہدف بننا چاہتا ہو، اتنی آسانی سے شکار ہوا کہ بس۔۔ نگاہِ یار شاعر کی ہستی میں یوں شامل ہو چکی ہے کہ اب پل پل اس کا دھیان اور خیال ہی شاعر کو لاحق ہے۔نہ وہ دفعتاً اس تیر کو رگ سے نکال باہر کر سکتا ہے کہ نشتر کے کھینچنے سے تکلیف ایک طرف، دوسرے رستے خون کا امکان بھی باعثِ تکلیف ہے اور نہ ہی وہ مستقلاً اس تیر کو اپنے اندر سہار سکتا ہے۔شاید وہ اس تمام آزار سے خوب واقف تھا جبھی اس نے خود کو محبوب کی نگاہ سے بچانے کی سعی کی، شاید وہ اس آزار کو پانے کا متمنی تھا جبھی اس نے خود کو تیر کا اس وقت نشانہ بننے دیا کہ جب تیر انداز کی شکاری مہارت بھی کمال حاصل کر چکی تھی اور شاعر کی شکار ہونے کی صلاحیت بھی فزوں ہو چکی تھی۔فراق کے ہاں محبوب کی نگاہ کا تیر تو رگِ جاں میں اتر کر منزل پا گیا لیکن غالب کے محبوب کی نگاہ کا تیر ابھی راہ میں سرگرداں ہے:

کوئی میرے دل سے پوچھے تیرے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

شعر:5

اگر چہ بے خودیٔ عشق کو زمانہ ہوا
فراق کرتی رہی کام وہ نظر پھر بھی

بے خودی: اپنے بس میں نہ رہنا

کارِ عشق میں اول اول جو بے تابی و بے قراری کی کیفیت ہوتی ہے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں ٹھہراؤ آجاتا ہے اور آتش عشق دروں خانہ بھلے بھڑکتی رہے، اس کے شعلوں کی لپک الاؤ سے باہر تک نہیں جاتی۔ شاعر کے مطابق عشق کے اوائل موسم گزر گئے ہیں۔ بے خودی قصہ پارینہ ہونے کو ہے، جوش کے ہوش میں آنے کا وقت ہوا چاہتا ہے۔ لیکن یہ کیا؟ وقت کے رتھ پہ سوار ہو کر یہاں تک پہنچنے کے بعد، اتنا سفر طے کرنے کے بعد عشق پر یہ عقدہ کھلتا ہے کہ وہ تو اسی مقام پر رہ گیا ہے جہاں سے اس کا سفر شروع ہوا تھا اور اس قیام کا سبب چشم یار کی جادو نگاہی ہے جو اب بھی سلامت ہے۔ شاعر کو محبوب کی نگاہ اب بھی ویسے ہی کاری ہے جیسی کہ اولین ایامِ عشق میں تھی۔ اب بھی محبوب کی نگاہ کو یہ کمال حاصل ہے کہ وہ کسی کا بھی قرار لوٹ لے اور شاعر کا شمار تو اس نگاہ کے پرانے متاثرین میں ہوتا ہے سو وقت بھی اس مقام پہ آ کر ٹھہر جاتا ہے اور نگاہِ یار کے مقابل وقت کی چوٹ عاشق پر کاری نہیں رہتی۔

3.2۔ غزل:2

دور آغاز جفا دل کا سہارا نکلا
حوصلہ کچھ نہ ہمارا نہ تمہارا نکلا
ہے ترے کشف و کرامات کی دنیا قائل
تجھ سے اے دل نہ مگر کام ہمارا نکلا
عبرت انگیز ہے کیا اس کی جواں مردی بھی
ہائے وہ دل جو ہمارا نہ تمہارا نکلا
رونے والے ہوئے چپ ہجر کی دنیا بدلی
شمع بے نور ہوئی صبح کا تارا نکلا
انگلیاں اٹھیں فراقِ وطن آوارہ پر
آج جس سمت سے وہ درد کا مارا نکلا

شعر:1

دور آغاز جفا دل کا سہارا نکلا
حوصلہ کچھ نہ ہمارا نہ تمہارا نکلا

دور: وقت، عرصہ

بے وفائی و جفا محبوب کی ادائے خاص ہے لیکن محبوب کے جور و جفا کا یہ رویہ عاشق کے لیے الٹا سہارا بن جاتا ہے

اوراس کے جذبات مزید گہرا رنگ پکڑ لیتے ہیں۔ایک طرف عاشق کا حوصلہ اورصبر برقرار ہے کہ باوجود محبوب کے ستم کے وہ سراپا الفت ہےاوراس کا حوصلہ ذرا بھی کم نہیں ہوا۔دوسری طرف محبوب جفا کا رویہ روا رکھے ہوئے ہےاوراس کے ہاں جورو ستم کی کمی کی کوئی صورت نہیں۔ایسے میں عاشق بھی اس کا ڈٹ کر مقابلہ کرر ہاہےاورمحبوب کے حوصلے پسپا کرنے کے لیے کوشاں ہے۔محبوب کے جورو جفانے عاشق کے حوصلوں کو بڑھانے اورمہمیز کرنے کا کام کیا ہے۔اب نہ تو محبوب ہی ستم میں تخفیف کرر ہاہےاور نہ ہی اس کے رویے کے مقابل عاشق کے حوصلے پست ہوتے ہیں۔یعنی حوصلے دونوں طرف برقرار ہیں۔

شعر:2

ہے ترے کشف و کرامات کی دنیا قائل
تجھ سے اے دل نہ مگر کام ہمارا نکلا

کشف:الہام،اعجاز،معاملہ فہمی

کرامات:کرم کی جمع،مہربانی کاعمل

قائل:معترف،مان لینا

شاعرمحبوب سےشکوہ کناں ہے کہ یوں تومحبوب کی الفت اورلطف وکرم کی ایک دنیا قائل ہے۔ہر دوسرا شخص محبوب کے اعجازات اورکمالات کا معترف اورمعتقد ہے۔ہرخاص وعام محبوب کے در سے فیض اٹھاتا ہےلیکن ہائے قسمت کہ شاعر کے نصیب میں محبوب کی طرف سے کوئی راحت،کوئی مہربانی نہیں۔۔کیا فائدہ محبوب کی اس ادائے دلبرانہ کا کہ جس سے شاعرمحروم رہاہے۔شاعر کے لیےتو پھرمحبوب کا جودوکرم ہونا نہ ہونا ایک برابر ہے کیونکہ اس کے نصیب میں اس کرم کی بارش میں بھیگنا نہیں بلکہ اس بابت اس کے دل میں ایک کسک سی موجود ہے۔ایک محرومی سی ہے کہ جوعاشق کا مقدر ہے۔

شعر:3

عبرت انگیز ہے کیا اس کی جواں مردی بھی
ہائے وہ دل جو ہمارا نہ تمہارا نکلا

عبرت انگیز:دوسروں کوعبرت دلانے والا

جواں مردی:عالم جوانی،طاقت کاعالم

شاعراپنے دل کی حالتِ زار پرافسوس کرر ہاہے کہ بھلااس دل کا کیا فائدہ جونہ تو خوداس کے کام آیا ہےاورنہ ہی محبوب کےکسی کام کا رہاہے۔دراصل اس کا دل عین جوانی میں محبوب پر یوں مرمٹا کہ اپنی جواں مردی کوخاک کرڈالا اور دوسروں کے لیے یہ عبرت کا معاملہ ہوگیا۔دل نے جس کے لیےاپنی جواں مردی لٹائی اس نے اس دل کا نذرانہ قبول نہ کیا

سو یہ دل اس کا ہو کے بھی اس کا نہ ہوا اور شاعر کے ہاتھوں سے تو خیر جاتا ہی رہا۔ دل کا یوں عنفوانِ شباب میں اس طرح لٹ جانا کہ جس کا مقدور بھر فائدہ بھی نہ ہو، خاصا تکلیف دہ ہے۔ ایک جذب بھرا دل بے کار گیا اور افسوس کہ نہ تو یہ صاحبِ دل یعنی عاشق اور نہ ہی محبوب کے کسی کام آیا۔ بقول شاعر:

تڑپوں گا عمر بھر دلِ مرحوم کے لیے
کم بخت، نامراد لڑکپن کا یار تھا

شعر:4

رونے والے ہوئے چپ ہجر کی دنیا بدلی
شمع بے نور ہوئی صبح کا تارا نکلا

ہجر کے مارے رات بھر روتے رہے لیکن صبح کا وقت قریب آنے لگا تو ان کے آنسو تھم گئے، وقت نے کروٹ لی اور ہجر کی سیاہی میں وصل کی امید روشنی بن کر پھیلنے لگی۔ رات کی شمع جل اور گھل چکی ہے اور اس نے اپنے حصے کا نور رات کی سیاہی نگلنے میں صرف کر ڈالا، اب جبکہ اس کی روشنی ختم ہو چکی ہے تو اس کی جگہ صبح کے تارے نے لے لی ہے۔ روشنی کا سلسلہ جاری ہے اور صبح کے تارے سے امید کی ڈور بندھی ہے۔ جس طرح یہ ستارہ رات کی سیاہی کو نگل رہا ہے، عین ممکن ہے کہ رات بھر کے ہجر کو بھی ساتھ ہی نگل جائے۔ ہجر کی دنیا بدلنے کا امکان موجود ہے اور ہجر زدہ اس امید پہ زندہ ہیں کہ وصل کا لمحہ آن پہنچنے کو ہے۔ صبح کا تارا امید و رجائیت کا استعارہ ہے جو ہجر زدگان کو وصل کی نوید سناتا ہے۔

شعر:5

انگلیاں اٹھیں فراقِ وطن آوارہ پر
آج جس سمت سے وہ درد کا مارا نکلا

وطن آوارہ: غریب الوطن، اپنے دیس سے دور

شاعر غریب الوطنی کا درد بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جس انسان کو اپنی آبائی دھرتی پناہ نہیں دیتی، جسے اپنا وطن چھوڑ کر اجنبی علاقے میں آباد ہونا پڑتا ہے، جس کے اردگرد بسنے والے لوگ اس کے اپنے نہیں بلکہ اغیار ہوتے ہیں۔ اس کی قسمت میں ہر جانب سے مداخلت لکھی ہے، سکون کا معاملہ نہیں، پردیس ہے، اپنوں سے جدائی ہے، وطن سے دوری ہے، اجنبیت اور انجان پنے کی کیفیت ہے، آوارگی اور بنجارگی مستزاد ہے۔ ایسے شخص کا کوئی ٹھکانہ نہیں، اس کی وحشت کہیں پناہ نہیں پاتی، زمین کا کوئی حصہ اسے اس کے آزار سمیت قبول نہیں کرتا۔ وہ جس سمت کو منہ کرے، جس طرف سے آن نکلے، وطن آوارگی کا احساس اس کے دیگر تمام احساسات پر غالب آجاتا ہے۔ وہ جس سمت بھی چلا جائے، اٹھتی انگلیاں اور اشارے اس کے رنج کو بہرحال نمایاں کر دیتے ہیں۔

3.3۔ غزل:3

طور تھا کعبہ تھا دل تھا جلوہ زار یار تھا
عشق سب کچھ تھا مگر پھر عالم اسرار تھا
نشہ صد جام کیف انتظار یار تھا
ہجر میں ٹھہرا ہوا دل ساغر سرشار تھا
جوہر آئینہ عالم بنے آنسو مرے
یوں تو سچ یہ ہے کہ رونا عشق میں بے کار تھا
دل دکھے روئے ہیں شاید اس جگہ اے کوئے دوست
خاک کا اتنا چمک جانا ذرا دشوار تھا
ذرہ ذرہ آئنہ تھا خود نمائی کا فراق
سر بسر صحرائے عالم جلوہ زار یار تھا

شعر:1

طور تھا کعبہ تھا دل تھا جلوہ زار یار تھا
عشق سب کچھ تھا مگر پھر عالم اسرار تھا

عالمِ اسرار: غیب کی دنیا

شاعر عشق کی مختلف صورتوں کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے مقاماتِ عشق و جنوں کا تذکرہ کرتا ہے۔ حضرت موسی کوہِ طور پر رب سے ملاقات کرتے تو ان کا دل عشقِ ربانی سے لبریز ہوتا۔ یوں حضرت موسی کو جو نسبت طور سے تھی وہ دنیا کے اور کسی مقام سے نہ تھی۔ اسی طرح اللہ کے حکم سے حضرت ابراہیم نے کعبہ کی از سرِ نو تعمیر کی اور اس کی بنیادوں میں بندگی اور عشق کی داستان رقم کی۔ سگے باپ کے تراشے بتوں کو کعبہ سے نکال باہر کرنا اور معاصرین کی مخالفت کے باوجود کعبہ کی تعمیر کرنا بجائے خود کارِ محبت کا ثبوت ہے۔ گویا کعبہ ہو یا کہ طور، مرکزی حیثیت عشق کی ہے۔ دونوں جگہیں یار کے ظہور کی جگہ ضرور تھیں لیکن جب عشاق نے ان جگہوں سے دور جا کر اپنے دل میں جھانکا تو وہاں بھی محبوب جلوہ افروز نظر آیا۔ طور سے دور بھی حضرت موسی کے دل میں رب ہوتا، محبوبِ خدا مکہ سے مدینہ گئے تب بھی رب کا عشق ان کے ہمراہ تھا۔ گویا عشق کا معاملہ صرف جلوہ زاروں تک محدود نہیں۔ عشق جب کائنات کا اسرار بن جاتا ہے، ظاہری معنی کھو دیتا ہے اور خارج سے باطن میں داخل ہو جاتا ہے تب کائنات کی ہر شے طور بن جاتی ہے، کعبہ بن جاتی ہے۔ جلوے کی تمنا نہیں رہتی کہ ہر جگہ ہی یار جلوہ گر ہے۔ جب مظاہرِ دنیا میں عشق اپنا سفر مکمل کر لیتا

ہےتو اس کے پیش نظر معاملاتِ اسرار آ رہتے ہیں۔واقعہ معراج عشق کی ایک ایسی ہی منزل ہے کہ جس کا تعلق زمان ومکان سے ماوراہے لیکن اس عالمِ اسرار کا احوال خود وہی جانتے ہیں کہ جو اس مظہرِ عشق کا حصہ ہیں۔شاعر بھی عشق کی ایسی ہی معراج کا ذکر کرتا ہے کہ جہاں بھید آشکار نہیں ہوتے بلکہ عشق سے آگے عالمِ اسرار کا دورہ ہوتا ہے۔

شعر:2

نشہ صد جام کیف انتظار یار تھا
ہجر میں ٹھہرا ہوا دل ساغر سرشار تھا

صد جام: سو پیالوں کے برابر

کیف: سرور،لطف

سرشار: مدہوش

عشق میں انتظار کی کیفیت کا اپنا ہی مزہ ہوتا ہے۔محبوب آئے گا،نہیں آئے گا،آئے گا،نہیں آئے گا۔پل پل آس ونراس کی کیفیت عاشق کی نبض کے ساتھ ساتھ سفر کرتی ہے۔انتظار میں اس قدر لطف ہے کہ سو پیالوں کے برابر نشہ پینے کے بعد جو سرور بادہ خوار کے حصے میں آتا ہے وہی سرور عاشق کو بھی محبوب کے لیے سراپا انتظار ہونے میں ملتا ہے۔انتظار کرتے کرتے عاشق ایک مقام پہ ہی ٹھہر گیا ہے،اس کے لیے وقت ٹھہر سا گیا ہے۔ہجر کی کیفیت اس پہ یوں طاری ہوئی ہے کہ اس کا دل رک گیا ہے۔لیکن اس کے بظاہر ٹھہرے ہوئے دل میں بھی جذبات کی اس قدر آمیزش تھی گویا یہ دل کسی جام کی طرح بیخودی سے لبریز ہو گیا ہو۔یعنی انتظار کی کیفیت میں دل کا ٹھہر جانا بوجہ مایوسی ہرگز نہیں بلکہ عاشق کو انتظار کی کیفیت کسی جام کی طرح سرشار کرتی رہی یہاں تک کہ ہوش وخرد بھی ہاتھ سے جاتے رہے اور وہ دل جو پہلے ہجر کی وجہ سے ٹھہرا ہوا تھا اب ہجر اور انتظار کے ساغر پیتے ہی مسرور ہو گیا۔ایک طمانیت ہے،سرشاری کی کیفیت ہے،بےخودی ہے کہ جو محبوب کے انتظار میں پنہاں ہے۔

شعر:3

جوہر آئینہ عالم بنے آنسو مرے
یوں تو سچ یہ ہے کہ رونا عشق میں بے کار تھا

جوہر: موتی

آئین عالم: دنیا کا آئینہ

عشق میں رونا اور آنسو بہانا اگرچہ معمول لیکن کارِ لغو ہے اور عاشق کو اس بات کو خوب علم ہے۔رونے سے بظاہر تو

کچھ حاصل نہیں ہوتا لیکن عشق کی ہی کرامت ہے جو پانی ایسے آنسوؤں کا درجہ بڑھا کر انہیں انمول موتیوں میں ڈھال دیتا ہے۔شاعر عشق کی اسی تاثیر کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ عشق میں بہے بے کار آنسو کانچ کے اس موتی جیسے نازک مگر کاری ٹھہرتے ہیں جس کے روبرو دنیا اپنا عکس،اعمال،افعال دیکھ سکتی ہے۔گویا آنسو وہ آئینہ ہے جو حق سے آگہی دیتا ہے۔شاعر کا کہنا ہے کہ دنیا کے آئینے کی چمک عاشق کے آنسوؤں کی بدولت ہے لیکن ہر آنسو کا یہ مقدور نہیں کہ وہ جوہرِ آئینہِ عالم بنے۔

شعر:4

دل دکھے روئے ہیں شاید اس جگہ اے کوئے دوست

خاک کا اتنا چمک جانا ذرا دشوار تھا

دشوار:مشکل

شاعر کوئے یار کی خاک کی چمک دمک دیکھ کر حیران ہے کہ بھلا مٹی کو اس چمک سے کیا علاقہ؟ دفعتاً عاشق کو یہ خیال آتا ہے کہ شاید یہاں دکھی دل روئے ہیں اور ان کے آنسوؤں میں اس قدر تاثیر تھی کہ مٹی سونا بن گئی۔دکھ نے آنکھ کے پانی کو وہ تاثیر بخشی کہ جیسے قطرِ نیساں صدف کو گوہر بخشتا ہے اسی طرح یہ رنج آمیز آنسو مٹی کے ذروں میں سونے کی چمک پیدا کر دیتا ہے۔سوال یہ ہے کہ دکھی دل کس کا ہے؟یار کے علاقے میں جا کر ایک تو خود شاعر کے رونے کا امکان ہے کیونکہ وہ بھی محبوب کے متاثرین میں سے ہے جبھی وہاں اس کا آنا جانا رہتا ہے،پھر اس امکان کی تائید اس بات سے بھی ملتی ہے کہ جس طرح وہ اس کوئے خاص کی مٹی کی چمک کی وجہ آنسوؤں کو ہی قرار دیتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود بھی اس گریہِ غم کا شکار رہا ہے،دوسرے یہ کہ کوئے دوست میں شاعر ایسے ہی دل جلے جا کر دل کے آبلے پھوڑتے ہیں جن سے رستا درد آنسو بن کر خاک کی چمک بن جاتا ہے۔

شعر نمبر 5:

ذرہ ذرہ آئنہ تھا خود نمائی کا فراق

سر بسر صحرائے عالم جلوہ زار یار تھا

اس شعر میں شاعر محبوبِ حقیقی کے حوالے سے کہتا ہے کہ محبوب کی ذات کائنات کی ہر شے میں جلوہ آرا ہے۔ذرے ذرے میں محبوب کے حسن کی جھلک نظر آتی ہے۔یا یوں کہیے کہ تمام عناصرِ فطرت کو محبوب نے اپنے حسن کا کچھ حصہ ودیعت کیا ہے اور اس قدر کہ محبوب کا وجود ذرے کی مثل چھوٹی سی چھوٹی شے میں بھی منعکس ہے۔تمام مظاہرِ کائنات میں محبوب کا وجود اپنی چھب دکھلاتا ہے۔اس وسیع وعریض دنیا میں کوئی وجود ایسا نہیں جس میں اس ذاتِ اقدس کا اظہار نہ ملتا ہو۔دنیا کی مثال ایک لق ودق صحرا کی سی ہے کہ جس میں سامانِ لطف کا وفور نہیں تاہم محبوب کی ذات ایک ایسا احساس ہے کہ جو صحرا کو گلزار بنا دیتا ہے۔دیکھنے والی آنکھ کو محبوب کا جلوہ فقط چمن کی رنگینیوں میں ہی نہیں ملتا بلکہ وہ ویرانوں میں بھی محبوب کا وجود ڈھونڈ لیتی ہے۔محبوب کی ذات صحرا کے ذرے ذرے میں چمک بن کے اترتی ہے اور یوں ویرانے بھی جلوہِ محبوب سے آباد ہو جاتے ہیں۔

3.4۔ غزل:4

نگاہ ناز نے پردے اٹھائے ہیں کیا کیا
حجاب اہل محبت کو آئے ہیں کیا کیا
بقدر ذوق نظر دید حسن کیا ہو مگر
نگاہ شوق میں جلوے سمائے ہیں کیا کیا
کہیں چراغ کہیں گل کہیں دل برباد
خرام ناز نے فتنے اٹھائے ہیں کیا کیا
تمام حسن کے جلوے تمام محرومی
بھرم نگاہ نے اپنے گنوائے ہیں کیا کیا
فراق راہ وفا میں سبک روی تیری
بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا

شعر:1

نگاہ ناز نے پردے اٹھائے ہیں کیا کیا
حجاب اہل محبت کو آئے ہیں کیا کیا

حجاب: پردو،شرم

محبوب کی نگاہ کا شیوہ رہا ہے کہ اس نے ہمیشہ عشاق سے اغماص برتا ہے لیکن جب یہ نگاہ اٹھ گئی تو کمال کرگئی۔ محبوب کی نازوادا سے بھرپور نگاہیں کبھی یوں اٹھنا گوارا نہیں کرتیں لیکن آج یہ نگاہیں یوں اٹھی ہیں کہ راز و نیاز کی سب باتوں پہ پڑے پردے سرک گئے ہیں۔ جب تک یہ نگاہ اٹھی نہ تھی، عاشق مشتاق تھے کہ ان نظروں کی سرمستی سے لطف اٹھا سکیں لیکن جب یہ نظریں اٹھیں تو عشاق میں یہ یارا ہی نہ رہا کہ وہ ان نگاہوں کا کیف سہار سکیں اور یوں سوائے اس کے کہ عاشق پسِ حجاب چلے جائیں، اورکوئی چارہ ہی نہ رہا۔ نگاہِ ناز ہمیشہ اسرار و رموز کے پردے اٹھانے پر مامور رہتی ہے مگر عشاق کی نگاہیں خیرہ ہو جاتی ہیں اور اس خیرگی کے باعث حجاب ہی باقی رہتا ہے۔ جیسے غالب کے نزدیک نظارہ ہمیشہ نقاب ہی کا کام کرتا ہے:

نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگاہ تیرے رخ پر بکھر گئی

شعر:2

بقدر ذوق نظر دید حسن کیا ہو مگر
نگاہ شوق میں جلوے سمائے ہیں کیا کیا

ذوقِ نظر کا کام فقط یہ ہی ہے کہ وہ اپنی بساط کے مطابق حسن کے نظارے اپنے دامن میں سمیٹ لے۔ جہاں تک حسنِ یار کی دید کی بات ہے تو وہ اہلِ نظر کے عمدہ ذوق کی مثال ہے۔ جس کا جتنا ذوقِ نظر ہوگا وہ اسی قدر اس حسن سے فیض یاب ہوگا۔ جب معاملہ ذوقِ نظر سے شوقِ نظر تک جاتا ہے تو دید کی طلب بڑھ جاتی ہے۔ مشتاق آنکھیں جلوہ یار کو دیکھنے کے لیے بیتاب نظر آتی ہیں اور اگر چہ ان طالب آنکھوں میں کامل جلوے کو جذب کرنے کی استعداد نہیں پھر بھی وہ اس جلوے کے کئی زاویے اپنے پردہ بصارت پر نقش کر لیتی ہیں۔ پھر حسن فقط ان ہی مشتاق آنکھوں تک محدود نہیں بلکہ اس کے بیمار تو بڑی تعداد میں ہیں۔ سو ان بیماروں کے چارے کو حسن جا بجا یہاں وہاں پھیلا ہے اور ہر جگہ یہ ایک نئے رنگ نئے انداز میں جلوہ گر ہے سو دیکھنے والی نظر بساط بھر جلوے سے حسن کی دولت کشید کر لیتی ہے۔

شعر:3

کہیں چراغ کہیں گل کہیں دل برباد
خرام ناز نے فتنے اٹھائے ہیں کیا کیا

خرام: چال

فتنہ: تباہی

محبوب کی چال میں اس قدر جادو ہے کہ اس کے نظارے سے بنتے کام بگڑنے لگتے ہیں۔ اس کی ناز بھری مستانہ چال کو چراغ نے دیکھا تو اس میں بھی سرمستی عود آئی اور اسی سرمستی کی وجہ سے پروانہ چراغ پہ قربان ہو جاتا ہے۔ چراغ کا کام تو روشنی کی صورت میں خیر بانٹنا ہے لیکن جب سے اس نے خرامِ یار کی ستم گری دیکھی ہے اس کی فطرت میں بھی یہی بات شامل ہو چلی ہے کہ اپنے مشتاق کی جان لے لی جائے۔ دوسری جانب باغ میں گل کا بھی یہی حال ہے۔ اس نے بھی جب سے یار کی سبک گامی دیکھی ہے اسے بھی ستم سوجھ رہے ہیں، طائرانِ چمن گل کی قربت کے متمنی ہیں لیکن حضرتِ گل ان کی محبتوں کی شدت سے قطع نظر محبوب کی چال پر فریفتہ ہیں۔ اور عاشق کے دل کا تو کوئی حال ہی نہ پوچھے۔ عاشق نے تو جب سے خرامِ یار کا نظارہ کیا ہے تب سے اس کا دل محبوب کے لیے فراشِ راہ ہونے کا متمنی ہے۔ محبوب کی چال اور ناز و انداز نے اپنے عاشق کی حالت اس قدر خراب کی ہے کہ اس کا دلِ برباد اب فقط آہیں بھرنے کے قابل ہی رہ گیا ہے۔ گویا خرامِ یار میں اس قدر جادو و فتنہ ہے کہ اس نے چراغ، گل اور عشق کے میدان میں اچھے اچھوں کی حالت بگاڑ ڈالی ہے۔ بہ الفاظِ غالب:

تیرے سرو قامت سے اک قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

شعر:4

تمام حسن کے جلوے تمام محرومی
بھرم نگاہ نے اپنے گنوائے ہیں کیا کیا

عاشق کی آنکھ شوقِ دیدار میں جلوے کی تمنا کر بیٹھی۔حسن لبِ بام آیا اور آنکھ میں یہ یارا نہیں کہ حسن کا جلوہ سہار سکے سو دیکھنے والی نگاہ کا بھرم ہی جاتا رہا۔طالب آنکھ اپنی طلب پر نادم ہے۔حسنِ عام تک تو اس کی رسائی بڑی آسانی سے ہو جاتی تھی لیکن حسنِ خاص کے معاملے میں وہ مشتاق نظر محروم ہی رہی۔ایسے میں صاحبِ نگاہ یہ سوچ کے رہ گیا کہ اس کی خواہشِ دیدار نے اور جلوہ یار نے اس کی کم نگاہی کا پول کھول دیا اور اسے اس بات کا بخوبی ادارک ہو گیا کہ وہ تو ظاہر کے جلوے کے انجذاب کا ہی اہل نہیں ،جبکہ اللہ تعالیٰ کے حسن و جمال کے جلوے کائنات میں ہر سو پھیلے ہوئے ہیں لیکن انسان کی کم نصیبی اس کی کم نگاہی کی صورت میں ہمیشہ نمایاں ہوتی ہے۔تشنگی اور محرومی انسان کا مقدر بنتی ہے۔

دیکھو تو چشمِ یار کی جادو نگاہیاں
بے ہوش اک نظر میں ہوئی انجمن تمام

شعر:5

فراق راہ وفا میں سبک روی تیری
بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگائے ہیں کیا کیا

سبک روی: روانی سے چلنا

عشق کا راستہ خاصا کٹھن ہے۔وفا کی راہ اتنی بھی آسان نہیں کہ ہر کوئی اس پہ بآسانی چلتا جائے۔یہ بہت مشکل راہگزر ہے اور یہاں اچھے اچھوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں۔لیکن شاعر کی ہمت کی داد دینا بنتی ہے کہ وہ اس راہگزر پر ثابت قدم رہا اور اس راہِ پرخطر کو کمال خوبی سے طے کر لیا۔اگر چہ بڑے بڑے عشاق اس سفر میں لڑکھڑا جاتے ہیں لیکن شاعر راہِ عشق کا اس قدر سبک گام راہرو ثابت ہوتا ہے کہ دیگر عشاق کے لیے ایک مثال بن جاتا ہے۔فراق کی سبک روی کا بیان شاعرانہ تعلّی کی عمدہ مثال ہے۔

3.5۔ غزل:5

غم ترا جلوہ گہہ کون و مکاں ہے کہ جو تھا
یعنی انسان وہی شعلہ بجاں ہے کہ جو تھا
پھر وہی رنگِ تکلم نگہہ ناز میں ہے
وہی انداز وہی حسنِ بیاں ہے کہ جو تھا
قرب ہی کم ہے نہ دوری ہی زیادہ لیکن
آج وہ ربط کا احساس کہاں ہے کہ جو تھا

جان دے بیٹھے تھے اک بار ہوس والے بھی
پھر وہی مرحلہ سود و زیاں ہے کہ جو تھا
آج بھی آگ دبی ہے دلِ انساں میں فراق
آج بھی سینوں سے اٹھتا وہ دھواں ہے کہ جو تھا

شعر:1

غم ترا جلوہ گہہ کون و مکاں ہے کہ جو تھا
یعنی انسان وہی شعلہ بجاں ہے کہ جو تھا

شعلہ بجاں: مسلسل غم کی کیفیت ہونا

انسان کو غم کی کیفیت ازل سے تحفے میں ملی ہے۔ کبھی غمِ جاں تو کبھی غمِ دوراں اور کبھی یہ غم پوری کائنات پر محیط نظر آتا ہے۔ دنیا کے پہلے انسان کو جب یہ غم لاحق ہوا کہ اس نے اپنے ہی خالق کی نافرمانی کی تو اس کے آنسوؤں سے کائنات کی ہر شے اشک بار ہو گئی۔ گویا غم نے زمان و مکاں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ انسانی غم کا سلسلہ ازل سے ابد پر محیط ہے۔ جذبۂ غم انسان کے خمیر میں گندھا ہے، اس سے چھٹکارا نہیں۔ انسان کے نفس میں جلتا شعلہ بیک وقت باعثِ تخریب بھی ہے اور باعثِ تعمیر بھی۔ جب انسان اپنے دل میں موجود سیاہ نطفے سے شر کی تحریک پاتا ہے تب ستم وجود میں آتا ہے اور جب انسان اپنے اندر اپنی خرابی کا غم محسوس کرتا ہے تب یہ غم اس کی شخصیت کی تعمیر کرتا ہے۔ انسان کے اندر خیر و شر کی یہ قوتیں ازل سے برسرِ پیکار ہیں اور ابد تک یہ سلسلہ یونہی رہے گا۔ بہ الفاظِ دیگر غمِ ازلی کی کیفیت ہی کے باعث انسان شعلہ بہ جاں ہے۔

شعر:2

پھر وہی رنگِ تکلم نگہہ ناز میں ہے
وہی انداز وہی حسنِ بیاں ہے کہ جو تھا

رنگِ تکلم: بات کرنے کا انداز

ایک وقت تھا کہ محبوب کی نظر عاشق پہ ملتفت تھی اور راز و نیاز کی سبھی باتیں آنکھوں ہی آنکھوں میں ہوتی تھیں۔ نگاہِ یار کو یہ کمال حاصل تھا کہ تمام مضمون نظر سے ہی بیان کر دیا جاتا اور الفاظ کو زحمت ہی نہیں دی جاتی تھی۔ عاشق نے آج تک حسنِ بیان کی یہ صورت نہیں دیکھی تھی کہ جہاں برزبانِ بندہ کلام بھی نہ ہو اور مدعا بھی بیان ہو جائے۔ نگاہِ یار کے اس ناز و انداز سے ملتفت ہوئے عاشق کو ایک عرصہ گزر چکا ہے اور آج مدت بعد اسے پھر یہ اتفاق ہوا کہ وہ اس خاص نگاہ سے کلام کرے۔ یہ جان کر اس کی حیرت کہیں جگہ نہیں پاتی کہ یار کی نگاہ میں آج بھی وہی رنگِ تکلم موجود ہے کہ جو عرصہ پہلے تھا۔ اب یا تو محبوب کو عاشق سے جو الفت تب تھی وہ اب بھی ہے، یا پھر یہ فقط محبوب کی ادائے محض ہی ہے، یا پھر حوادثِ زمانہ نے محبوب کی نگاہ میں عاشق کے لیے تلطف کا یہ رنگ بھر دیا ہے اور دیگر کی جفا نے محبوب کو عاشق سے کلام پر مجبور کیا ہے۔ جو بھی ہے انداز تکلم بہرحال وہی ہے کہ جو اول اول عاشقی کے دور میں تھا۔

شعر:3

قرب ہی کم ہے نہ دوری ہی زیادہ لیکن
آج وہ ربط کا احساس کہاں ہے کہ جو تھا

عاشق کے ساتھ محبوب نے ہمیشہ متوسط رویہ اختیار کیا ہے، نہ التفات زیادہ نہ ہی بے رخی۔ بس بین بین ہی رشتہ رکھا ہے۔ عاشق تو بس اس پہ بھی خوش تھا کہ چلو کم ہی سہی نسبت تو ہے، نیم پختہ ہی سہی تعلق تو ہے، تھوڑی ہی سہی الفت تو ہے۔ لیکن اب تو ربط کا وہ کچا پکا احساس بھی باقی نہیں رہا۔ وہ نیم تعلقی بھی جاتی رہی ہے۔ شاعر اسی نیم تلطف کو ڈھونڈ رہا ہے کہ جو اسے درِ یار سے بخشش ہوتا رہا، کامل الفت کی تو کیا صورت۔ افسوس کہ اب وہ آدھی ادھوری محبت کا احساس بھی باقی نہیں رہا ہے۔ اور جب یہ احساس ہی رخصت ہو گیا تو کچھ ایسی صورتِ حال بن گئی کہ:

کچھ تو احساسِ زیاں تھا پہلے
دل کا یہ حال کہاں تھا پہلے
اب بھی تو پاس نہیں ہے لیکن
اس قدر دور کہاں تھا پہلے

شعر:4

جان دے بیٹھے تھے اک بار ہوس والے بھی
پھر وہی مرحلہ سود و زیاں ہے کہ جو تھا

عشق کی راہ بڑی پرخطر ہے اور اس کٹھن راستے پر سفر کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ عشاق تو اس راستے پر بصد شوق سفر اختیار کرتے ہیں کیونکہ وہ اس راہ کی مشکلات کو برداشت کرنا جانتے ہیں لیکن یہی سفر اہلِ ہوس کے لیے مشکل ثابت ہوتا ہے۔ اہلِ ہوس کا شیوہ عشق نہیں بلکہ انہیں زندگی کے ہر مرحلے میں سود و زیاں کا پاس رہتا ہے۔ اس شعر میں بھی ایسے ہی معاملے کی طرف اشارہ ہے۔ شاعر کا کہنا ہے کہ جب اہلِ ہوس نے عشق اختیار کیا تو ظاہری حسن پرستی ان کا شعار ٹھہری اور وہ جان داؤ پر لگا بیٹھے۔ ان کی بے چینی عروج پر تھی کیونکہ یہ طبقہ معاملاتِ زندگی میں جس سود و زیاں اور جن تخمینوں اندازوں کا عادی رہا ہے وہ کارگاہِ عشق میں بے سود و بے کار ہے۔ عاشق اور بوالہوس میں بنیادی فرق یہی ہے کہ عاشق کارزارِ عشق میں ثابت قدم اور دنیا سے بے نیاز رہتا ہے جبکہ بوالہوس نفع نقصان سے آگے سوچ ہی نہیں پاتا۔ شاعر نے کمال طنز کرتے ہوئے اہلِ ہوس کے معمولاتِ عشق پر چوٹ کی ہے کہ اگر وہ عشق میں جان دینے کی غلطی کر بھی لیں تو جلد ہی ان کی کاروباری فطرت اسے پچھتانے پر مجبور کرنے لگتی ہے۔

شعر:5

پھر تیری چشمِ سخن سنج نے چھیڑی کوئی بات
وہی جادو ہے وہی حسنِ بیاں ہے کہ جو تھا

چشمِ سخن سنج: کلام کے فن سے آشنا نظر

محبوب کی نگاہ گفتگو کے ہنر سے خوب واقف ہے۔ نگاہِ یار کو یہ کمال حاصل ہے کہ وہ کلام کی طاقت سے مقابل کو اپنا بنالے۔ یا پھر عشاق خود ہی اس نگاہ کے مقابل لٹنے کو بے تاب بیٹھے ہیں کہ جونہی نظر کا اشارہ ہوا ادھر اس اشارے سے حکم پا لیا گیا اور تعمیل ہوگئی۔۔ گویا محبوب کی نگاہ کے پاس بظاہر گویائی کی طاقت تو نہیں لیکن بات کہنے کا فن خوب ہے کہ جس کے سننے کو عشاق بے تاب ہیں۔ نگاہِ یار کا یہ کمال کسی طور کم نہیں ہوا بلکہ کل ہی کی مانند آج بھی ہر طرف اس نگاہ کا اعجاز ویسا ہی ہے، جیسا پہلے تھا۔

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ کیوں نہ اپنی خوبی قسمت پہ ناز کرے

شعر:6

آج بھی آگ دبی ہے دلِ انساں میں فراق
آج بھی سینوں سے اٹھتا وہ دھواں ہے کہ جو تھا

انسان کا دل غم کی آماجگاہ ہے اور حوادثِ زمانہ انسان کے خانہ دل کے ہمیشہ سے مکیں ہیں۔ یہ غم آگ کی صورت انسان کا جگر جلا ڈالتے ہیں۔ کبھی تو آہ کی صورت بن پاتی ہے اور کبھی یہ چنگاری اندر ہی دبی رہتی ہے۔ کل بھی انسان غم زدہ تھا، آج بھی ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ یہی اس کی سرشت میں ہے کہ وہ غم محسوس کرے، غم کا اظہار کرے۔ اب اس غم کا محرک مختلف ہوسکتا ہے، محسوسات البتہ ایک سی رہتی ہیں۔ غم کا ایک محرک تو اکثر انسان خود ہی ہوتا ہے۔ کل بھی انسان کے دل میں آگ دبی تھی اور آج بھی انسان کا دل دھواں دھواں ہے۔ میر نے اسی مضمون کو اپنے الفاظ میں یوں باندھا ہے:

دیکھ تو دل کہ جاں سے اٹھتا ہے
یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے

4۔ خود آزمائی

1۔ فراق کی غزل کن عوامل کی بنیاد پر بیسویں صدی کی غزل میں ایک علاحدہ شناخت رکھتی ہے؟ وضاحت کیجیے۔

2۔ ''میں نے اس آواز کو مرمر کے پالا ہے فراق'' اس شعر کے تناظر میں فراق کی شاعری کا جائزہ لیجیے۔

3۔ فراق کی شاعری میں عشقیہ کیفیات کا ویسا اظہار نہیں جیسا ان کے معاصرین و ماقبل شعرا کے ہاں دکھائی دیتا ہے؟ بحث کیجیے۔

4۔ ایک غزل گو شاعر کی حیثیت سے فراق کے شعری امتیازات پر نوٹ لکھیے۔

5۔ مجوزہ کتب برائے مطالعہ:

1۔ فراق گورکھپوری، گلِ نغمہ (صدی ایڈیشن)، ادارہ انیس اردو، الہ آباد، 1997ء

2۔ کامل قریشی (مرتب)، اردو غزل، اردو اکادمی، دہلی، 1987ء

3۔ محمد حسن عسکری، مجموعہ محمد حسن عسکری، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، 1994ء

4۔ نیاز فتح پوری (مرتب)، بیسویں صدی میں اردو غزل، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، 1987ء

5۔ شمیم حنفی (مرتب)، فراق: دیارِ شب کا مسافر، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، 1996ء

6۔ رسالہ، نیا دور (مدیر: امیر احمد صدیقی)، فراق نمبر (حصہ دوم)، لکھنو، 1984ء

یونٹ نمبر 9

غزلیات ناصر کاظمی

تحریر: ڈاکٹر محمد قاسم
نظرِ ثانی: پروفیسر ڈاکٹر محمد کامران

فہرست

یونٹ کا تعارف

عزیز طلبہ وطالبات

اس یونٹ میں آپ ناصر کاظمی کی شخصیت وفن کا مطالعہ کریں گے اور اس کے منتخب کلام کا جائزہ لیں گے۔ ناصر کاظمی جدید اردو غزل کا ایک منفرد نام ہے۔ ناصر کاظمی کی شاعری نے قیام پاکستان کے بعد بہت توجہ حاصل کی۔ ناصر کی شاعری میں موجود تقسیم ہند و مابعد کے مسائل، ہجرت، آبادکاری، لٹے پھٹے قافلوں کی حالت زار، یادرفتگاں اور سنسان گلیاں غزل کو نئے موضوعات سے متعارف کروانے کا باعث بنیں۔ ناصر نے اپنے عہد کے آشوب کو اپنی تنہائی و اداسی کے ساتھ آمیز کر کے اردو غزل کو ایک نئی پہچان عطا کی اور نظم کے مقابل غزل کا چراغ روشن کیا۔

یونٹ کے مقاصد

امید ہے کہ اس یونٹ کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ:

1۔ ناصر کاظمی کے سوانح بیان کر سکیں۔

2۔ اردو غزل کی تاریخ میں ناصر کاظمی کا مقام متعین کر سکیں۔

3۔ ناصر کے طرز سخن اور رنگ خاص کا تعین کر سکیں۔

4۔ ناصر کاظمی کی غزلیات کو سمجھ سکیں اور ان کی تشریح کر سکیں۔

5۔ غزل کو نئے موضوعات سے روشناس کرانے کے حوالے سے ناصر کاظمی کی خدمات بیان کر سکیں۔

1۔ ناصر کاظمی

(1925ء۔1971ء)

1.1 سوانح

ناصر کاظمی کا اصل نام سید ناصر رضا کاظمی تھا۔آپ 8 دسمبر 1925 کو انبالہ میں پیدا ہوئے۔ان کے والد سیّد محمد سلطان کاظمی محکمہ فوج سے وابستہ تھے۔ان کی والدہ انبالہ کے مشن گرلز اسکول میں معلّمہ تھیں جہاں سے ناصر نے پرائمری تک تعلیم حاصل کی۔میٹرک کا امتحان مسلم ہائی اسکول انبالہ سے پاس کیا۔ بی اے کے لئے لاہور گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا لیکن تقسیم کے ہنگاموں کی وجہ سے تعلیم ادھوری چھوڑنا پڑی۔ناصر ناز ونعم میں پلے بڑھے تھے اور ان کے مشاغل میں کبوتر بازی، گھڑسواری، سیر سپاٹا شامل تھے جوان کی بے فکری اور کھلنڈرے پن کے غماز تھے۔انبالہ میں ان کی شاندار کوٹھی تھی جس سے ان کے اندازِ زندگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ہجرت کے بعد ان کی زندگی سے عیش ونشاط رخصت ہوئے اور انہیں قدرے مشکل حالات نے آن گھیرا۔ہجرت کے پانچویں سال ان کی شادی ان کی خالہ زاد شفیقہ بیگم سے ہوئی۔ان کے والدین تقسیم و مابعد کے مصائب زیادہ دن نہیں جھیل سکے اور چل بسے۔ہجرت کے بعد دس سال تک وہ لاہور میں انارکلی کے ایک خستہ حال مکان میں مقیم رہے۔ہجرت کے بعد ناصر کو مناسب روزگار نہ ملا اور نہ ہی اجنبی دیس میں ان کا کوئی پرسانِ حال تھا۔انہوں نے محکمہ بہبود اور محکمہ زراعت میں معمولی درجے کی ملازمت کی۔۱۹۵۰۔۵۱ء میں ''اوراقِ نو'' اور ۱۹۵۲۔۵۷ء کے عرصے میں ہمایوں کی ادارت کی۔۱۹۵۷ء میں ناصر نے اپنا رسالہ ''خیال'' جاری کیا لیکن ناکامی ہوئی۔ ۱۹۶۴ء میں وہ ریڈیو پاکستان سے بطور سٹاف آرٹسٹ منسلک ہوئے اور باقی زندگی اسی شعبے سے وابستہ رہے۔ناصر چھبیس سال کی عمر سے ہی دل کے مرض میں مبتلا تھے لیکن صحت کی پروا نہ کرتے تھے۔پان اور سگریٹ کا نشہ کرتے تھے۔غذائی معمولات بھی غیر متوازن تھے۔رات بھر آوارہ گردی ان کا معمول تھی۔1971 میں ناصر کو معدے کا کینسر تشخیص ہوا اور 2 مارچ 1972 کو یہ مرض ان کی جان لے گیا۔

ناصر کاظمی کے کتبے پر اُنہی کا یہ زبان زدِ عام شعر درج ہے:

دائم آباد رہے گی دنیا
ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہو گا

ناصر کی طبیعت میں شاعری کی پرداخت بچپن سے ہی ہو رہی تھی۔ان کی والدہ نے انہیں گلستاں، بوستاں، شاہنامہ فردوسی، قصہ چہار درویش، فسانۂ آزاد، الف لیلی، صرف ونحو اور اردو شاعری کی کتابوں کی تعلیم دی جن کا اثر ان کی شاعری میں بھی ملتا ہے۔ان کی والدہ شاعری سے خاصا شغف رکھتی تھیں سو ان کی طبیعت میں بھی یہ عنصر در آیا۔پندرہ سال کی عمر میں ناصر نے شعر گوئی کا آغاز کیا۔ اوائل دور کی شاعری میں میر اور اختر شیرانی کا رنگ نظر آتا ہے تاہم ناصر کی پہچان یہ

رنگ نہیں بلکہ ان کا منفرد انداز ہے۔ ناصر نے اپنی زندگی کے سفر کا بڑا حصہ چائے خانوں میں دوست احباب کے ساتھ راتیں گزار کر طے کیا۔اس مسافت نے ناصر کی شاعری کو بہترین نظموں اور غزلوں کی منزل بخشی یہاں تک کہ ان کی شاعری میں فقط جذبات کی یورش ہی نہیں بلکہ حقائق کا بیان بھی ملنے لگا۔شاعری سے حد درجہ لگاؤ کی بنا پر وہ اسے اپنا مذہب مانتے تھے۔ان کی شاعری انسان کے لطیف جذبات کی عکاس ہے۔شاعری کا پہلا مجموعہ ''برگ نے'' کے نام سے ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا۔ ان کی زندگی میں ان کی تین ہی کتب شائع ہوئیں جبکہ باقیوں کی بعد از وفات اشاعت ہوئی۔''برگ نے'' کے علاوہ دیگر کتب میں ''دیوان'' مطبوعہ ۱۹۷۳ء، ''پہلی بارش'' مطبوعہ ۱۹۷۵ء، ''نشاطِ خواب'' مطبوعہ ۱۹۷۷ء، ''سر کی چھایا'' مطبوعہ ۱۹۸۱ء، ''خشک چشمے کے کنارے'' مطبوعہ ۱۹۷۲ء شامل ہیں۔علاوہ ازیں ناصر کے شعری انتخابات بشمول ''انتخاب ولی''، ''انتخاب میر'' اور ''انتخاب نظیر'' بھی شائع ہوئے۔شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اک اچھے نثر نگار بھی تھے۔ ریڈیو کی ملازمت کے دوران انہوں نے کلاسیکی اردو شاعروں کے خاکے لکھے جو بہت مقبول ہوئے۔

1.2 عہد ناصر

ناصر کاظمی کی شاعری کی ابتدا یوں تو 1940ء میں ہوئی لیکن ادبی حلقوں سے ان کا تعارف اس وقت ہوا جب 1942ء کے آل انڈیا مشاعرے میں لاہور ریڈیو اسٹیشن سے ان کا کلام نشر ہوا۔انہوں نے اختر شیرانی سے متاثر ہو کر شاعری کا آغاز کیا اور سانیٹ میں طبع آزمائی کی لیکن زیادہ آگے نہ بڑھ سکے۔ ناصر نے خود ہی یہ محسوس کر لیا کہ ان کی سانیٹ میں تقلیدی رنگ نمایاں ہے سو انہوں نے غزل کی طرف رجوع کیا۔غزل کی بابت وہ حفیظ ہوشیار پوری سے مشورہ لیتے تھے جو بیسویں صدی کے دوسرے ربع کے مشہور شاعر تھے۔ حفیظ کے مشورے ناصر کے حق میں مفید ثابت ہوئے اور اس مشاورت کی بدولت ناصر کے کلام کا حسن بڑھ گیا یہاں تک کہ وہ اپنی انفرادی پہچان بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ناصر کی شاعری اردو ادب میں ایک نئی آواز اور تجربے کی حیثیت سے سامنے آئی۔ بہ الفاظِ دیگر ناصر اپنی غزل میں ایک نئے لہجے اور نئی سوچ کی ترجمانی کرتے ہیں۔جس زمانے میں ناصر کاظمی نے غزل گوئی کو اختیار کیا تب داغ، جگر، حسرت، فراق، فیض کی غزلیں اپنا اپنا رنگ جما چکی تھیں۔ یہ دور غزل کے مقابل نظم کی پذیرائی کا دور تھا اور نظم کے میدان میں میراجی اور راشد نے کامیاب تجربات کیے۔ایسے میں ناصر کی غزل کا توجہ پانا اور اپنی الگ پہچان بنانا ایک مشکل امر تھا لیکن ناصر نے غزل کا پیرایہ قدرے منفرد انداز میں اپنایا اور اور دادِ سخن سمیٹی۔ ناصر کی غزل میں کلاسیکی روایت اور خیال کی جدت کا خوبصورت امتزاج ملتا ہے۔ناصر کی شاعری میں موجود تقسیمِ ہند و مابعد کے مسائل، ہجرت، آبادکاری کے مسائل، لٹے پٹے قافلوں کی حالتِ زار اور سنسان گلیاں غزل کو نئے موضوعات سے متعارف کروانے کا باعث ہیں۔ناصر کی غزل کا خمیر انہی عناصر سے تیار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں اداسی، درد اور غم کے احساسات نمایاں ہیں۔ان کی شاعری کے روایتی موضوعات میں غمِ عاشقی، غمِ

روزگار، غمِ زمانہ اور ذاتی کرب کا اظہار موجود ہے۔

1.3 میر کے لہجے کی بازگشت

ناصر نے غزل کو اپنے کرب اور دکھ کی ترجمانی کا وسیلہ بنایا۔ غزل کے معاملے میں وہ روایت پرست ہیں۔ ان کی غزل میں خارجی ماحول اور تاریخی تسلسل کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کا سوز و گداز بھی جھلکتا ہے۔ ان کی غزل کا لہجہ متوازن اور دھیما ہے۔ ہیجان انگیزی ناصر کا شعار نہیں۔ دھیمے لب و لہجے کا حامل ناصر کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

یہ کیا کہ روز ایک سا غم ایک سی امید
جی چاہتا ہے اب کوئی تیرے سوا بھی ہو

یہاں ناصر کے کمال سادہ لہجے پر میر کے لہجے کا گمان ہوتا ہے۔ کہیں کہیں طرزِ اظہار کے اعتبار سے تو اکثر مقامات پر مزاج کے اعتبار سے بھی ناصر میر سے مماثل معلوم ہوتے ہیں۔ بلکہ ان کے ہاں میر کے طرزِ اظہار سے زیادہ میر کا طرزِ احساس نمایاں ہے۔ اس کی ایک وجہ تو دونوں کا فطری حساس مزاج ہے جبکہ دوسری اہم وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ناصر کو بھی میر کے سے معاصر حالات کا سامنا تھا۔ میر نے جس طرح اپنے دور کے تہذیبی آشوب کو اپنی غزل میں جگہ دی اسی طرح ناصر نے بھی اپنی غزل میں اپنے عہدِ پرفتن کو سمویا۔ ناصر کے ہاں بھی وہی غریب الوطنی، قافلوں کا گرنا پڑنا، افلاس، حکام کی بے اعتنایاں، معاشی و معاشرتی زبوں حالی، اہلِ فن کی ناقدری جیسے مسائل آن ٹھہرے جن کا سامنا میر نے کیا تھا۔ دونوں نے ہجرت کے دکھ جھیلے۔ ناصر اور میر کی شعوری سطح میں یک گونہ مماثلت ہے۔ جس کے توسط سے دونوں نے غمِ ذات کے ساتھ ساتھ غمِ زمانہ کو بھی شدت سے تھا۔ محسوس کیا اور دونوں کی شاعری میں اس زمانی تخریب کی وجہ سے دکھ، درد، کرب اور اضطراب کی کیفیات شامل ہوگئیں۔ کچھ کام غمِ عاشقی نے کر ڈالا اور یوں شعری محرکات قریب ایک سے ہونے کے باعث ناصر کی شاعری میں میر کا رنگ جھلکنے لگا۔

1.4 ہجرت اور آشوب کے مناظر

ناصر کی شاعری کے موضوعات میں ہجرت ایک اہم اور وقیع موضوع ہے۔ ناصر نے برصغیر کی آزادی کے ہنگاموں کو دیکھا اور اس آزادی کے عوض ملنے والے دکھ اور آلام اُن کی روح کو جھنجوڑ گئے۔ ہجرت کے صدمات نے ناصر کی شخصیت پر گہرا اثر ڈالا۔ یہ ہجرت ان کے لیے صرف ایک مقام سے دوسرے مقام تک کا سفر نہ تھی بلکہ انہوں نے ایک طرزِ زندگی سے دوسرے طرزِ زندگی تک کو اپنانے کا سفر کیا۔ پہلے اندازِ زندگی کے طور اطوار، رشتے، دوست احباب، زمان و مکاں ناصر کی شخصیت میں اس قدر رچے ہوئے تھے کہ انہیں چھوڑ کر ایک نئی زندگی کا سفر ان کے لیے آسان نہ تھا۔ اگرچہ دیگر مہاجرین کی طرح کہیں ان کے اندر بھی آزادی کا خواب تکمیل پا رہا تھا لیکن اس خواب کی

تکمیل کے لیے ناصر کے کئی اورخواب گرد ِراہ ہو گئے۔ تقسیم کے فسادات کے دوران بپا ہونے والی قتل وغارت، لوٹ مار، افراتفری وغیر یقینی صورتِ حال نے ناصر جیسے حساس انسان کو اولاً حواس باختہ کرڈالا اور بعدازاں یہ تمام حوادث ان کی ذات میں اس طرح حلول کر گئے کہ ان کی شناخت بن گئے۔ ناصر کے عہد کی ویرانی اور انتشار کے تناظر میں یہ اشعار دیکھیے۔

انہیں صدیوں نہ بھولے گا زمانہ
یہاں جو حادثے کل ہو گئے ہیں
دیتے ہیں سراغ فصل گل کا
شاخوں پہ جلے ہوئے بسیرے
ڈیرے ڈالے ہیں بگولوں نے جہاں
اس طرف چشمہ رواں تھا پہلے
اب وہ دریا نہ وہ بستی نہ وہ لوگ
کیا خبر کون کہاں تھا پہلے
پرانی صحبتیں یاد آرہی ہیں
چراغوں کا دھواں دیکھا نہ جائے
جنگل میں ہوئی شام ہم کو
بستی سے چلے تھے منہ اندھیرے

ان اشعار سے جو منظر نامہ ترتیب پاتا ہے اس سے بخوبی ناصر کے کرب کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

1.5 یادرفتگاں

ناصر اگر چہ ہجرت سے وابستہ مصائب وآلام کے نہ صرف عینی شاہد رہے بلکہ ان سے متاثر بھی ہوئے اس کے باوجود ہجرت کا سانحہ ان کی شاعری میں صرف تلخ نوائی کا ہی موجب نہ بن سکا بلکہ انہوں نے ہجرت سے اپنی شاعری کے لیے خوبصورت، منفرد اور پرتاثیر رنگ کشید کیے۔ ان رنگوں میں سب سے اہم رنگ ''یاد'' کا ہے۔ یاد ان کی شاعری کا اہم محرک ہے۔ ان کی یادوں میں بچپن سے جوانی اور پھر مابعد کے تمام مشاہدے شامل ہیں جن میں ہجرت سے وابستہ یادوں کے علاوہ عشق، دوست احباب، انبالے کی گلیاں، کچھ حاصلات کچھ لاحاصلات نمایاں ہیں۔ یہ سب یادیں ناصر کے لیے یادرفتگاں ہیں۔ ناصر کی شاعری میں جابجا یادِرفتگاں کا ذکر ملتا ہے۔

رونقیں تھیں جہاں میں کیا کیا کچھ
لوگ تھے رفتگاں میں کیا کیا کچھ

مل ہی جائے گا رفتگاں کا سراغ
اور کچھ دن پھرو یونہی اداس اداس

ہر نفس شوق بھی ہے منزل گا
ہر قدم یاد رفتگاں بھی ہے

چین سے بیٹھنے نہیں دیتی
چمن یاد کی اداس ہوا

ناصر کی شاعری میں رفتگاں کی یاد اوراس سے وابستہ کسک واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔لیکن ناصر کی خاص بات یہ ہے کہ وہ اس یاد کے غلبے سے قنوطی نہیں ہوتے بلکہ رفتگاں کے معاملے میں وہ خاصے حقیت پسند اور جدت پسند ہیں۔انہیں اس بات کا بخوبی ادراک ہے کہ جوگزر چکا ہے وہ ماضی کا حصہ ہےاور ماضی کے مقابل حال کی حیثیت ماضی کے مسلمہ ہے۔ان کا یہی رویہ رجائیت کا عکاس ہےجس کی بدولت ان کی شاعری میں حقیقت حال سے آشنائی کا رنگ بھی واضح ملتا ہے:

رفتگاں کا نشاں نہیں ملتا
اگ رہی ہے زمیں پہ گھاس بہت

1.6 عشق کا رنگ

ناصر کی شاعری میں یادوں کا ایک جہان آباد ہےجن میں ایک نمایاں یادعشقیہ رنگ کی بھی ہے۔اگر چہ یہ رنگ ان کی تمام یادوں پہ چھایا ہوانہیں تاہم اتنا پختہ ضرور ہے کہ اپنی الگ شناخت رکھتا ہے۔ ناصر کی غزل کے تب وتاب کامحرک عشق ہے۔عشق ان کی تخلیقی قوت کومتحرک کرتا ہے۔وہ عشق کے جذبے سے سیراب ہیں مگران کا یہ جذبہ ان کے مخصوص تہذیبی اورسماجی ماحول سے متصل ہے۔وہ جس محبوب کو چاہتے ہیں اس کی دوری کے شکوہ سنج اور اس کی قربت کے آرزومند ہیں لیکن وہ قرب محبوب سے محروم ہیں۔اس کے نتیجے میں وہ دکھ اور کرب سے گزرتے ہیں اورجگرسوز کیفیت کومحسوس کرتے ہیں۔ناصر کے ہاں محبوب سے قرب ہو یا دوری، وصل وہجر کی کیفیات پا کیزگی سے عاری نہیں۔دراصل ناصر کی شعری شخصیت مخصوص تہذیبی اور معاشرتی حالات کی پروردہ ہےاس لیے عشقیہ جذبات

کے اظہار میں بھی سماجی اور تہذیبی اقدار کا احساس ہوتا ہے۔ یہاں عشق انسانی رشتوں کی سچائی، دل آویزی اور جذب وکشش کے ساتھ ساتھ شکست دل کے المیے میں ڈھل جاتا ہے۔

وہ دل نواز ہے لیکن نظر شناس نہیں
مرا علاج مرے چارہ گر کے پاس

کم فرصتی خواب طرب یاد رہے گی
گزری جو ترے ساتھ وہ شب یاد رہے گی

پھر جس کے تصور میں برسنے لگی آنکھیں
وہ برہمی صحبت سب یاد رہے گی

ہوتی ہے تیرے نام سے وحشت کبھی کبھی
برہم ہوئی ہے یوں بھی طبیعت کبھی کبھی

کچھ یادگار شہر ستم گر ہی لے چلیں
آئے ہیں اس گلی میں تو پتھر ہی لے چلیں

ناصر کی شاعری میں سستے جذبات کا گزر نہیں بلکہ ان کے ہاں عاشق پختہ دماغ ہے اور بڑے قرینے سے اپنے جذبات بیان کرتا ہے۔ عشق غزل کا روایتی اور بنیادی موضوع ہے۔ ناصر نے اس روایت کی بڑے سبھاؤ سے پیروی کی ہے۔ ان کی غزل میں عشق عمومی رویہ ہے جسے جدتِ ادا نے خصوصی بنا دیا ہے۔ وہ عشق کی واردات اور کیفیت میں تنوع پیدا کرتے ہیں۔ ان کے موضوعات اگرچہ روایتی ہیں لیکن ان کا اندازِ بیان اچھوتا اور منفرد ہے:

یہ سانحہ بھی محبت میں بارہا گزرا
کہ اس نے حال بھی پوچھا تو آنکھ بھر آئی

تیرے خیال سے لو دے اٹھی ہے تنہائی
شب فراق ہے یا تیری جلوہ آرائی

غمِ عاشقی کے ساتھ ساتھ ناصر کی شاعری میں غمِ روزگار کے رنگ بھی نظر آتے ہیں۔ ایک نئے ماحول میں تلاشِ معاش نے ان کے ضبط کو خوب آمایا۔ ظاہر ہے ماقبل ہجرت ان کے ذہن میں حصولِ معاش کے حوالے سے جو

بھی خیالات تھے ان کا بعد از تقسیم ویسے پورا ہونا ممکن نہ تھا۔ وقت اور مقام کی تفریق نے ناصر کی زندگی کو مشکل بنا دیا اور وہ معاشی فکروں کے تابع آ گئے۔ حوادثِ زمانہ نے ناصر کی شخصیت میں اداسی کے رنگ بھر دیے۔ شاید اسی لیے ناصر کے ہاں اکثر مضامین پر اداسی کا عنصر غالب معلوم ہوتا ہے۔ ایک مستقل اداسی، تنہائی اور اجنبیت کی کیفیت ناصر کی شاعری پر چھائی ہوئی ہے لیکن یہ اداسی ناصر کی تخلیقی صلاحیتوں کو جلا بخشتی ہے۔ ناصر کے پاس اپنی ذات کی اداسی کو کائنات کی اداسی پر محیط کرنے کا ہنر موجود ہے اس لیے ان کی محسوسات کا دائرہ بھی وسیع ہے:

یوں تو ہر شخص اکیلا ہے بھری دنیا میں
پھر بھی ہر شخص کا مقدر نہیں تنہائی

ہمارے گھر کی دیواروں پہ ناصر
اداسی بال کھولے سو رہی ہے

ناصر نے صرف خود کو اداسی کے خول میں بند نہیں کیا بلکہ اپنی اداس نظر سے اپنے اردگرد پھیلی اداسی کو بخوبی محسوس کیا۔ ان کے لیے اداسی ایک ذاتی کیفیت سے بڑھ کے ایک عمومی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ ڈاکٹر آفتاب احمد ناصر کی اداسی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''ناصر بڑے دکھے ہوئے دل کا شاعر تھا لیکن چونکہ اس نے اردو کی کلاسیکی روایت سے اکتسابِ فیض کیا تھا اس لیے اس کے جذبے اور آواز میں وہ روک تھام، وہ ٹھہراو بلکہ وہ وقار بھی ہے جو ایک پختہ تہذیبی روایت میں پلے ہوئے مزاج کی نشانی ہے۔'' (اداس شاعر اجنبی مسافر، مشمولہ: ہجر کی رات کا ستارا (مرتب: احمد مشتاق)، نیا ادارہ، ۵۱ سرکلر روڈ لاہور۔ ص:۱۲۹)

ناصر اگرچہ دکھے دل کے شاعر ہیں لیکن دکھ اور اداسی میں بھی ان پر انفعالی کیفیت طاری نہیں ہوتی۔ کہیں نہ کہیں ان کے ہاں امید باقی رہتی ہے۔ رجائیت کا عکاس ایک شعر درج ہے:

خاک بھی اڑ رہی ہے رستوں پر
آمد صبح کا سماں بھی ہے

1.7 محاسن کلام

ناصر کاظمی کی غزل کو ان کے عہد کی شعری فضا کے پس منظر میں دیکھا جائے تو یہ نظم کے عروج کا زمانہ تھا۔ نظم کے اس ماحول میں ناصر نے اپنی غزل کو تمثال کاری اور تجسیم کاری سے مزید کیا۔ ناصر کی تخلیقی اپج اور شعری روایت

سے استفادے کی بدولت اردو غزل میں تمثال کاری کے تجربے کو نہ صرف فروغ ملا بلکہ غزل میں حسیاتی تنوع بھی پیدا ہوا۔اس سلسلے میں جہاں ناصر نے فطرت کے مظاہر کی عکاسی کی وہاں ان نقوش کے پس منظر میں تہذیبی پہلوؤں کو بھی علامتی انداز میں اجاگر کیا جو ہندوستان اور بعد ازاں پاکستان میں رونما ہونے والے واقعات سے تعلق رکھتے ہیں۔ ناصر کی تمثالوں میں اُس تہذیبی آشوب کی تصویریں بھی ملتی ہیں جو تقسیمِ ہند کے وقت سامنے آیا۔ہجرت اور اُس کے نتیجے میں فسادات کی تصویریں ناصر کی غزل میں دیکھی جا سکتی ہیں:

کیا تماشا ہے کہ بے ایام گل
ٹہنیوں کے ہاتھ پیلے ہو گئے

کیاریاں دھول سے اٹی پائیں
آشیانہ جلا ہوا دیکھا
فاختہ سرنگوں ببولوں میں
پھول کو پھول سے جدا دیکھا

ناصر کی غزل میں فطرت سے لگاؤ کا رجحان واضح ہے۔ان کے اشعار میں قدرت کے متنوع مظاہر و مناظر اپنے بھرپور رنگوں کے ساتھ جلوہ گر نظر آتے ہیں۔سرو کے درخت، سرسوں کے پھول، گھاس کے ہرے سمندر، فاختائیں، کونجیں، لال کھجوریں، چلتا دریا، چاند، تارے اور ڈھلتی رات جیسے مناظر اُن کی غزل میں فطرت کی مختلف صورتوں کا اظہار ہیں۔

انتظار حسین سے ایک گفتگو میں ناصر نے کہا تھا کہ فطرت کوئی Romantic چیز نہیں ہے۔۔۔یہ ایک بڑی مہذّب تہذیب ہے جسے صدیوں میں انسان نے خون دے دے کر پالا ہے، اس کے استعارے اس کی زندہ علامتیں ہیں۔آپ اندازہ کریں جس شہر میں درخت ہوں، پرندے ہوں، کبوتر ہوں، چڑیاں ہوں، آسمان کھلے ہوں وہ کوئی Romantic نہیں۔Romantic کون کہتا ہے اسے۔اس کے پیچھے تصور کرو اُس معاشرے کا کہ کیسے لوگ بستے ہوں گے جنھوں نے وہ پھول لگائے ہیں۔۔۔وہ درخت اگائے ہیں''۔(ٹی وی انٹرویو مشمولہ: ہجر کی رات کا ستارہ، ص:۳۰۲)

اس تناظر میں دیکھیں تو ناصر کی تمثالوں میں اس مہذب تہذیب کے خدوخال بڑی آب و تاب کے ساتھ نمایاں ہیں۔ناصر نے فطرت کے متنوع مظاہر و مناظر کو کہیں تہذیبی آشوب کے تناظر میں دیکھا اور کہیں یہی مناظر اور تمثالیں چاند اور گھاس کے ہرے سمندروں کی صورت میں مرہم کا کام کرتی ہیں اور جینے کا سہارا بنتی ہیں۔

پھر کاگابولا گھاس کے ہرے سمندر میں
رت آئی پیلے پھولوں کی تم یاد آئے

فکری پختگی کے ساتھ ساتھ ناصر کی غزلوں میں فنی پختگی بھی ملتی ہے۔ناصر کے کلام میں تکرارِلفظی ،سادگی وسلاست ، سہلِ ممتنع ،تشبیہات واستعارات کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں جوان کی شاعرانہ قدرت کی مظہر ہیں۔ان کے کلام کی یہی تاثیراورتاثر انہیں دیگر شعراسے ممیّز کرتا ہے۔وہ اپنے خیالات کوسادگی سے شعر کا پیراہن پہنا دیتے ہیں۔ان کے ہاں کوئی ملمع اورتصنع نہیں ملتا۔برجستگی ان کے کلام کا خاصا ہے۔کمال یہ ہے کہ حد درجہ سادگی بھی ان کے کلام کوسپاٹ نہیں کرتی بلکہ ان کے اشعار میں یہ سادگی ہی جذبات کے ایسے رچاؤ کا باعث بنتی ہے کہ قاری کوناصر کی وارداتِ قلبی اپنی واردات معلوم ہونے لگتی ہے۔ناصر عام الفاظ استعمال کرتے ہوئے خاص شعر کہنے کا ہنر رکھتے ہیں اوران کا یہی ہنر ایک حساس قاری کوتادیر متحیر رکھتا ہے۔

ناصر کاظمی نے برصغیر کی آزادی کے ہنگاموں کودیکھا اوراس آزادی کے عوض ملنے والے دکھ اورآلام اُن کی روح کوجھنجوڑ گئے۔ہجرت کے صدمات نے ناصر کی شخصیت پر گہرا اثر ڈالا۔ناصر کاظمی تقسیمِ ہند کے بعد سقوط ڈھاکا کے دلخراش مناظر کے بھی شاہد رہے۔ناصر نے اپنے عہد کے آشوب اورالمیہ کواپنی تنہائی اوراداسی کے ساتھ آمیز کر کے اپنی غزل میں ایسا مجسم کیا کہ وہ وہ انھی کی شناخت بن گیا۔اگر دیکھا جائے تو اُن کی شاعری ان دوادوار کے دوران پاکستان کی سماج اورتہذیبی زندگی کی تاریخ کا منظر نامہ بھی ہے،جس کا ہر منظر انھوں نے اپنے آنکھ سے دیکھا اپنی شعور سے قبول کیا اوراپنے وجدان سے تخلیق کیا۔

2۔ اہم نکات

1۔ ناصر کاظمی کی شاعری قیام پاکستان کے بعد بہت مقبول ہوئی۔

2۔ ناصر نے نظم کے ماحول میں غزل کا چراغ روشن کیا۔

3۔ ناصر کی غزل کلاسیکی روایت اور خیال کی جدت کا حسین امتزاج ہے۔

4۔ ناصر کے لہجے میں میر کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

5۔ اپنے عہد کا تہذیبی آشوب ناصر کی غزل میں بہت نمایاں ہے۔

6ا ہجرت، نقل مکانی، فسادات، حوادث اور انتشار کے مناظر ناصر کی غزل میں جا بہ جا دکھائی دیتے ہیں۔

7۔ ناصر کی شاعری میں یادوں کا ایک جہاں آباد ہے اور اس میں سب سے اہم اور نمایاں رنگ یادرفتگاں کا ہے۔

8۔ اداسی اور تنہائی کے باوجود ناصر کے ہاں رجائیت اور امید کا پہلو باقی رہتا ہے۔

3۔ تشریحات

3.1۔ غزل:1

ہوتی ہے تیرے نام سے وحشت کبھی کبھی
برہم ہوئی ہے یوں بھی طبیعت کبھی کبھی

اے دل کسے نصیب یہ توفیق اضطراب
ملتی ہے زندگی میں یہ راحت کبھی کبھی

جوشِ جنوں میں درد کی طغیانیوں کے ساتھ
اشکوں میں ڈھل گئی تری صورت کبھی کبھی

تیرے قریب رہ کے بھی دل مطمئن نہ تھا
گزری ہے مجھ پہ یہ بھی قیامت کبھی کبھی

کچھ اپنا ہوش تھا نہ تمہارا خیال تھا
یوں بھی گزر گئی شب فرقت کبھی کبھی

اے دوست ہم نے ترک محبت کے باوجود
محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی

شعر:ا

ہوتی ہے تیرے نام سے وحشت کبھی کبھی
برہم ہوئی ہے یوں بھی طبیعت کبھی کبھی

وحشت: بے چینی، پریشانی، الجھن
برہم: بگاڑ، خرابی، تخریب، ناساز
طبیعت: مزاج، محسوسات

اس شعر میں شاعر اپنی افتادِطبع کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ معمول میں تو محبوب کا نام شاعر کو راحت فزا رہتا ہے لیکن کبھی کبھی اس کی طبیعت میں اس قدر وحشت عود آتی ہے کہ وہی نام جو کبھی اس کی تسکین کا باعث ہوتا ہے، طبیعت کی برہمی کی بنا پر اب وہ نام باعثِ وحشت ہو چلا ہے۔ طبیعت کا یوں برہم ہونا اچانک وقوع نہیں پاتا بلکہ اس کے پیچھے حوادث کا ہاتھ معلوم ہوتا ہے۔ ناصر کے ہاں فقط عشقِ لطیف ہی نہیں بلکہ جذبات اور حالات ہر دو کی یورش ملتی ہے۔ شاعر کی طبیعت الفت و وحشت کا مرقع ہے۔ وحشت جب الفت پہ غالب آتی ہے تو محبوب کا نام بھی باعثِ راحت نہیں رہتا۔ شعر میں " کبھی کبھی"

سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ موصوف کی طبیعت ہمہ وقت برہم نہیں رہتی بلکہ یہ وقت وقت کی کہانی ہے اور وقت ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا۔

شعر:2

اے دل کسے نصیب یہ توفیق اضطراب
ملتی ہے زندگی میں یہ راحت کبھی کبھی

اضطراب: بے چینی

شاعر دل کی بے چینی کو ایک خاص عطا سمجھ کے وصول کرتا ہے اور دل سے کلام کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ عطائے خاص (یعنی اضطراب) ہر ایک کا مقدر نہیں اور نہ ہی یہ دولتِ عام ہے، یہ تو کبھی کبھار ملنے والی راحت کی مثل ہے۔ اس کے نزدیک اضطراب کوئی معمولی شے نہیں بلکہ اسی میں تو زندگی کی بقا مضمر ہے۔ اضطراب ہی وہ عنصر ہے جو دل کی تحریک کا ضامن ہے اور سوزِ دل پہ منتج ہے۔ دل پر سوز ہوگا تب ہی اس کی حرکت تیز تر ہوگی اور اسی حرکت میں زندگی کا راز چھپا ہے۔ شاعر کے نزدیک ہر دل اس قابل بھی نہیں کہ اسے اضطراب کی دولت ملے بلکہ یہ تو خاصوں کے حصے میں آتی ہے اور ایسا اس لیے بھی ہے کہ ہر دل یہ بار اٹھانے کا یارا نہیں رکھتا۔

شعر:3

جوشِ جنوں میں درد کی طغیانیوں کے ساتھ
اشکوں میں ڈھل گئی تری صورت کبھی کبھی

طغیانی: لہروں، موجوں کی تیزی

شاعر پر جوش و جذبات نے اس قدر کاری وار کیا ہے کہ وہ ہوش وخرد کا دامن چھوڑ بیٹھا ہے۔ وفورِ جذبات کے باعث ہوش پر جوش کا رنگ غالب آ چکا ہے۔ جنون عشق کے سفر کی عطائے خاص ہے اور اس پہ مستزاد درد کا مدوجزر۔ جنوں کے اس عالم میں درد لہروں کی صورت ابھرتا اور ڈوبتا ہے۔ گاہ بگاہ شدت اختیار کرتا ہوا درد جوشِ جنوں کے بڑھاوے کا سبب بنتا ہے۔ جنون اور درد کی اس کیفیت کا محرک فراقِ یار ہے۔ عدم وصال کی وجہ سے درد بڑھتا جا رہا ہے۔ فرقت کی شدت سے شاعر کی آنکھیں اشک بار ہیں۔ ان آنسوؤں میں درد، جنون اور ہجر کی کاٹ اس قدر شامل ہے کہ محبوب کی صورت ان آنسوؤں میں بہہ جاتی ہے۔ وفورِ اشک سے محبوب کا چہرہ دھندلا جاتا ہے۔ حالتِ درد و جنوں سے گریہ میں اس قدر شدت پیدا ہو جاتی ہے کہ جس سے محبوب کے چہرے کے نقوش تک مٹ جاتے ہیں۔ اس سیلِ رواں میں محبوب کا چہرہ یوں بہتا ہے کہ اپنی شناخت کھو دیتا ہے۔

شعر:4

تیرے قریب رہ کے بھی دل مطمئن نہ تھا
گزری ہے مجھ پہ یہ بھی قیامت کبھی کبھی

عشق کے سفر میں عموماً وصلِ یار ہی منزل ٹھہرتی ہے اور محبوب کا قرب ہی حاصلِ خواہش رہتا ہے لیکن شاعر کے ہاں معاملہ کبھی کبھی اس کے برعکس بھی ملتا ہے۔ شاعر ایک مدت سے وصل کی آرزو رکھتا ہے۔ اور جب وصل کی گھڑی آتی ہے تو اس کے لیے وصل کی یہ کیفیت برداشت کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اسے یہ قرینہ ہی نہیں کہ وصل کیسے منایا جائے۔ ستم یہ کہ کبھی کبھی ظاہراًواصل ہونے کے باوجود شاعر کو محبوب درحقیقت میسر نہیں ہوتا۔ نارسائی کا احساس محبوب کی قربت کے باوجود شاعر کے دل کو بے چین رکھتا ہے۔ شاعر کے لیے وہ لمحہ قیامت سے کم نہیں ہوتا کہ جب لمحاتِ وصل میں بھی اسے فرقت کا احساس ڈنک مارتا ہے۔ بہ الفاظِ دیگر شاعر پر وہ لمحے قیامت کی طرح وارد ہوتے ہیں جب اس کے پہلو میں محبوب مجسم موجود ہوتا ہے لیکن محبوب کا خیال کہیں اور ہوتا ہے۔ ایسے میں اس کے لیے محبوب کا وجود قطعاً باعثِ راحت نہیں ہوتا۔ گویا شاعر کی یہ خواہش ہے، تمنا ہے کہ وہ بھی وصل کی بارش سے ویسے ہی لطف و کرم کا گھونٹ بھرے جیسا کہ معمولاتِ عشق میں ہوتا ہے لیکن افسوس کہ محبوب اس کے بے چین دل کی تسکین کا سامان نہیں کر پاتا اور یوں شاعر کے لیے یہ لمحات وصل قیامت ہو جاتے ہیں۔

شعر:5

کچھ اپنا ہوش تھا نہ تمہارا خیال تھا
یوں بھی گزر گئی شب فرقت کبھی کبھی

شبِ فرقت: ہجر کی رات

وصلِ یار اگر عشق کی منزل ہے تو لمحاتِ فرقت عشق کے سفر کے وہ پڑاؤ ہیں جن پہ قیام عاشق کی جستجو کو تیز تر کر دیتا ہے، پھر وہ عاشق جو فرقت کے صدمے میں جلتا بجھتا وصل کی منزل تک آن پہنچتا ہے اس کا سفرِ عشق تمام ہو جاتا ہے، لیکن وہ عاشق جو ہمہ وقت فرقتِ یار میں وقت گزارتا ہے، عشق کے باب میں وصل کے ساتھ ساتھ ہجر اور فراق کی کیفیت بھی مسلمہ ہے۔ درد وغم کی یلغار نے شاعر کے ہوش یوں اڑائے کہ خیالِ یار جاتا رہا۔ وفورِ غم سے محبوب کی ذات کا احساس رخصت ہو جاتا ہے۔ شاعر کے ہاں عدم کیفیت کا یہ عالم ہے کہ وہ محبوب کی جدائی کے صدمے جھیلنے بیٹھا ہے اور اسے محبوب کا خیال ہی نہیں آتا۔ اسے اپنا ہوش تو خیر ہے ہی نہیں، محبوب کا بھی خیال تک نہیں اور اس پہ مستزاد کہ وہ اس عالم میں گزری شب کو "شبِ فرقت" کا نام دیتا ہے، گویا اپنی سی کوشش ضرور کرتا ہے محبوب کی جدائی کا غم منانے کی۔ یہاں پھر ناصر کی ذات سے وابستہ عناصر کی جدائی ناصر اور اس کے محبوب کے درمیان پائی جانے والی کیفیتِ فراق میں دخیل نظر آتی ہے اور شاعر شبِ فرقت

میں جی بھر کے محبوب کو روبھی نہیں پاتا۔ دیگر صدمات نے شاعر کو اس قدر نیم جاں کر رکھا ہے کہ شاید اس کے نزدیک محبوب کے ہجر کا صدمہ اپنے معنی کھو چکا ہے، اور نہیں تو اس ہجر کی شدت میں تخفیف تو ضرور ہی ہو چکی ہے۔ شبِ فرقت گھڑی کی سوئیوں کے مطابق تو بسر ہو جاتی ہے، آدابِ فرقت کے مطابق ہرگز بسر نہیں ہوتی۔

شعر:6

اے دوست ہم نے ترکِ محبت کے باوجود
محسوس کی ہے تیری ضرورت کبھی کبھی

ترک: چھوڑ دینا

کارِ عشق کو چھوڑ دینا عاشق کی سب سے بڑی آزمائش ہے۔ محبت کا فعل حضرت انسان کی سرشت میں قدرت کی طرف سے شامل کردہ ہے اور یہی فعل انسان اور حیوان کو ایک دوسرے سے ممیّز کرتا ہے۔ حیوان کے ہاں جذبہ انس ضرور ہے لیکن جذبہ محبت نہیں کہ محبت انس سے آگے کا عمل ہے۔ جب انسان اس فعل کو ہی ترک کر ڈالے تو گویا وہ اپنے فطری شخصی وصف کی نفی کرتا ہے اور اپنی ذات کی یہ نفی خاصی تکلیف کا باعث بنتی ہے۔ اس شعر میں بھی شاعر ایسی ہی کیفیت سے دوچار ہے۔ وہ ترکِ محبت کا ارتکاب کرتا ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کا یہ فعل ظاہری ہے۔ حقیقت اس کے برعکس ہے جبھی تو ترکِ الفت کے باوجود اسے اپنے محبوب کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ شاید محبت سے منہ موڑنا کوئی جبری فعل ہو جس کے نتیجے میں ظاہراً تو ترکِ محبت کا فعل وقوع پاتا ہے لیکن عملاً شاعر کا دل محبوب کے لیے تڑپ اٹھتا ہے۔ جب کبھی شاعر کے وجود میں اس کی نیم جان محبت سر اٹھاتی ہے تو اسے بے اختیار اپنے محبوب کی طلب محسوس ہوتی ہے۔ یہاں محبت سے دامن کشی کے باوجود محبوب کی ضرورت کا بیان شاعر کے احساس میں پنہاں کسک کی طرف ایک اشارہ ہے۔

ہوتی نہیں قبول دعا ترکِ عشق کی
جی چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں

3.2۔ غزل:2

گئے دنوں کا سراغ لے کر کدھر سے آیا کدھر گیا وہ
عجیب مانوس اجنبی تھا مجھے تو حیران کر گیا وہ
خوشی کی رت ہو کہ غم کا موسم نظر اسے ڈھونڈتی ہے ہر دم
وہ بوئے گل تھا کہ نغمہ جاں مرے تو دل میں اتر گیا وہ
نہ اب وہ یادوں کا چڑھتا دریا نہ فرصتوں کی اداس برکھا
یوں ہی ذرا سی کسک ہے دل میں جو زخم گہرا تھا بھر گیا وہ

بس ایک منزل ہے بوالہوس کی ہزار رستے ہیں اہل دل کے
یہی تو ہے فرق مجھ میں اس میں گزر گیا میں ٹھہر گیا وہ
وہ رات کا بے نوا مسافر وہ تیرا شاعر وہ تیرا ناصر
تری گلی تک تو ہم نے دیکھا تھا پھر نہ جانے کدھر گیا وہ

شعر:1

گئے دنوں کا سراغ لے کر کدھر سے آیا کدھر گیا وہ
عجیب مانوس اجنبی تھا مجھے تو حیران کر گیا وہ

سراغ: پتا،نشان
مانوس: جس سے انس ہو

ناصر کی زندگی ماضی سے وابستہ یادوں اور لوگوں سے عبارت ہے۔ وہ حال کے چہرے میں گزرے وقت کی پرچھائیاں تلاش کرتا ہے۔اس شعر میں ایک ایسے شخص کا ذکر ملتا ہے جس سے شاعر کا بظاہر کوئی تعلق نہیں،کوئی پہچان نہیں، وہ شاعر کے لیے اجنبی ہے، شاعر اس سے ناواقف ہے نا آشنا ہے۔لیکن اس اجنبی کی شخصیت پر ایامِ رفتہ کے نقوش ملتے ہیں، اس اجنبی کی مٹی سے ماضی کی باس آتی ہے، اس کی باتوں میں گزرے وقتوں کا نشان ملتا ہے اور یہ نقوش، یہ خوشبو، یہ نشان شاعر کو اس قدر قریب اور عزیز ہیں کہ شاعر آن کی آن میں شناسائی کے سارے مراحل طے کرتے ہوئے اس اجنبی سے انس محسوس کرنے لگتا ہے اور وہ شخص اسے مانوس لگنے لگتا ہے۔کیا معلوم وہ اجنبی شاعر کے محبوب کا سا ہو، کیا معلوم اس کی باتوں سے شاعر کے محبوب کا کوئی نشاں ملتا ہو۔معلوم نہیں اس اجنبی نے ماضی کے کون سے خفتہ گوشوں سے یوں پردہ سرکایا کہ شاعر پر انس ومحبت کے در وا ہو گئے۔شاعر ابھی اجنبی کی باتوں کے زیرِ اثر ہی ہوتا ہے کہ اجنبی نامعلوم مقام کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔شاعر کو نہیں معلوم کہ وہ کہاں سے آیا اور کہاں گیا لیکن وہ جو کوئی بھی تھا شاعر کو چند لمحوں کے لیے ماضی میں کھینچ لے گیا جس پر شاعر اب بھی حیران کھڑا ہے۔ضروری نہیں کہ وہ اجنبی کوئی مجسم شخص ہی ہو، وہ اجنبی کسی بھی ایسی شے کی علامت ہے جو بظاہر شاعر کے لیے اجنبی اور انجان ہے لیکن اس سے جڑے خواص شاعر کو ماضی میں دھکیل دیتے ہیں۔

شعر:2

خوشی کی رت ہو کہ غم کا موسم نظر اسے ڈھونڈتی ہے ہر دم
وہ بوئے گل تھا کہ نغمہ جاں مرے تو دل میں اتر گیا وہ

بوئے گل: پھول کی خوشبو
نغمہ جاں: زندگی بخش نغمہ

محبوب ذات شاعر کے ہر لمحے میں شامل ہے۔ وہ اپنے محبوب کو اپنے لمحاتِ نشاط میں شامل دیکھنا چاہتا ہے اور اس کے نزدیک اس کی خوشی کی تکمیل بھی تب ہی ہے کہ جب اس کا محبوب شاملِ حال رہے۔ دوسری جانب جب شاعر اداس ہوتا ہے تب بھی اس کی نظر محبوب کو ڈھونڈتی ہے۔ وہ اپنے غموں میں بھی محبوب کی شراکت چاہتا ہے کہ شاید اس کی شرکت محبوب کے غم میں کمی کر دے۔ شاعر کا محبوب بھی کیا ہی کمال ہوگا کہ وہ شاعر کی ذات کے اندر تک تحلیل ہو گیا ہے۔ وہ کسی پھول کی خوشبو کی طرح ہے جسے شاعر نے سانس کھینچ کو اپنے وجود میں اتار لیا ہے۔ وہ کوئی خوش نوا نغمہ ہے جسے شاعر نے اپنی سماعتوں میں یوں بسایا ہے کہ وہ ہر لمحہ شاعر کے اندر گونجتا ہے۔ خوشبو بن کر، نغمہ بن کر محبوب شاعر دل کی مسند پہ اس طرح براجمان ہو گیا ہے کہ اب شاعر کے دکھ اور سکھ ہر دو کیفیات میں محبوب کی موجودگی لازم ہے۔

شعر:3

نہ اب وہ یادوں کا چڑھتا دریا نہ فرصتوں کی اداس برکھا
یوں ہی ذرا سی کسک ہے دل میں جو زخم گہرا تھا بھر گیا وہ

برکھا: رم جھم، پھوار، ہلکی بارش
کسک: کمی، درد کی ہلکی لیکن مسلسل کیفیت

اس شعر میں شاعر طوفان گزر جانے کے بعد کی سی کیفیات بیان کرتا ہے۔ جس طرح منہ زور آندھی راستے میں آئی ہر چیز کو اڑاتی، چیختی چنگھاڑتی پسماندگان پر اپنے نقش ثبت کرتی اپنے پیچھے ایک سکوت چھوڑ جاتی ہے اسی طرح محبت بھی طوفان کی مانند ہے جس کی باقیات میں شاعر کا ساکت وصامت بت ہے، جس پہ بعد از طوفان اب کوئی ضرب کاری نہیں۔ یاد، اب شاعر کے بحرِ جذبات میں تلاطم برپا نہیں کرتی بلکہ کہیں زیرِ آب کروٹ لیتی ہے تو سطح پر بھنور بننے لگتے ہیں۔ محبت شاعر کے اندر دفن ہے اور مدفن کشائی کے لیے شاعر کے پاس فرصت ہی نہیں۔ غمِ روزگار نے شاعر کی ذات سے فرصت کا عنصر ہی منہا کر ڈالا ہے یا پھر شاعر کے لیے یہ اداس فرصت اتنی تکلیف دہ ہے کہ اس نے خود ہی اس سے فرار اختیار کر لیا ہے۔ شاعر کے دل پر محبت نے جو گہرے گھاؤ لگائے تھے ان کا مرہم مصروفیت ہی ہے۔ وقت اور مصروفیت نے شاعر کے زخم خوردہ دل پر اس طرح مرہم رکھا کہ گہری چوٹ کہیں اندر دب گئی اور اب فقط کسک باقی رہ گئی ہے۔۔ یہ اور بات کہ یہ کسک بھی شاعر کا سکون غارت کرنے کو اس طرح کافی ہے کہ شاعر کو یادوں کے جوار بھاٹے، اداسی بھری فراغت اور دل کے گہرے زخموں کی یاد گاہے گاہے دلاتی ہی رہتی ہے۔

شعر:4

بس ایک منزل ہے بوالہوس کی ہزار رستے ہیں اہل دل کے
یہی تو ہے فرق مجھ میں اس میں گزر گیا میں ٹھہر گیا وہ

بوالہوس: نفسانی خواہشات رکھنے والے لوگ

شاعر کا کہنا ہے کہ جن لوگوں کے پیشِ نظر نفس کی خواہشات ہوتی ہیں وہ اپنی خواہشات کی تکمیل کو ہی منزل سمجھ بیٹھتے ہیں۔ان کا سفر ایک چھوٹی سی شے کی خواہش کے ساتھ شروع ہوتا ہے اور رفتہ رفتہ ان کی خواہش کا حجم بڑھتا چلا جاتا ہے حتٰی کہ وہ ایک عالی مرتبت شے کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور اس اعتبار سے ان کے لیے دنیاوی مناصب و مراتب، جاہ و شوکت، قدر و منزلت، تخت و تاج جیسی اشیا ہی حاصلِ زیست ہوتی ہیں۔ایسی خواہشات انسان کی سوچ کو محدود کر دیتی ہیں اور اس کو ہر وقت ایک ساکت و جامد منزل ہی نظر آتی ہے۔اہلِ دل کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ان کے سامنے محبت کا وسیع آسمان ہے جہاں اس کی سوچ کا پنچھی جذبات کی ہوا کو پروں میں بھر احساس کو اپنی منزل بناتا ہے اور احساس کا مضمون اس قدر وسیع ہے کہ اس کے لیے درد، رنج، غم، الم، دکھ، سکھ، راحت، الفت، محبت، ناز، انداز، ادا جیسے کئی باب ازبر کرنے پڑتے ہیں تب کہیں جا کر بات بنتی ہے۔ دوسرے مصرعے میں شاعر ایک نادیدہ شخص، شاید اپنے محبوب میں اور خود میں خطِ تفریق کھینچتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ دوسرا شخص بوالہوس تھا کہ جس نے دنیا پر قناعت کر لی، دنیا کو اپنی منزل جانا اور اسی پر ٹھہر گیا۔۔جبکہ شاعر کی مثال ایک ایسے اہلِ دل کی سی ہے جو احساس کی دولت سے مالا مال ہے اور اس کی منزل میں کوئی پڑاؤ نہیں بلکہ اس کا سفر جاری رہنے والا ہے اسی لیے وہ اس مقام سے گزر آیا جہاں اس کا مخاطب ٹھہر چکا ہے۔دراصل یہ ترجیحات کا فرق ہے، بوالہوس کی منزل قیام اور سکون ہے جبکہ اہلِ دل جونہی منزل تک پہنچتے ہیں، منزل اور آگے کو جا ٹھہرتی ہے اور یوں وہ قیام کے بجائے حرکت میں ہی رہتے ہیں اور اول الذکر کو کہیں پیچھے چھوڑ آتے ہیں۔

شعر:5

وہ رات کا بے نوا مسافر وہ تیرا شاعر وہ تیرا ناصر
تری گلی تک تو ہم نے دیکھا تھا پھر نہ جانے کدھر گیا وہ

بےنوا: بے آواز، خاموش

رات کا استعارہ شاعری میں معنوی اعتبار سے خاصی وسعت کا حامل ہے۔کہیں یہ ظلمت و تیرگی کی منفی علامت کے طور پر مستعمل ہے تو کہیں اسی ظلمت سے پھوٹتی نور کی کرن امید افزا ثابت ہوتی ہے۔ناصر کے ہاں رات ایک خاص مقام رکھتی ہے۔۔وہ رات گئے تک سڑکیں ناپتے اور شعر کہتے۔۔اس شعر میں بھی ناصر خود کو رات کا بےنوا مسافر قرار دیتے ہیں۔۔گویا شاعر ایک خاموش مسافر ہے جس کی آواز رات کی خاموشی نے اپنے اندر جذب کر لی ہے، برلبِ شاعر کوئی خواہش کوئی آرزو آواز بن کر نہیں مچلتی۔ زندگی آواز سے عبارت ہے اور بےنوائی زندگی کے جمود کی علامت

ہے۔رات کی خاموشی میں بے نوا شاعر زندگی سے کٹ گیا ہے۔لیکن ساتھ ہی وہ سفر میں ہے اور سفر زندگی کی علامت ہے، شاعر ایک ایسا مسافر ہے جس کی قوتِ گویائی سلب ہوگئی ہے ، وہ بیک وقت زندہ ہے بھی اور نہیں بھی ۔ اس متذبذب کیفیت میں شاعر محبوب کو مخاطب کرتا ہے اور خود کو " تیرا شاعر، تیرا ناصر " کہہ کر انتہا درجے کی سپردگی کا اظہار کرتا ہے۔یعنی شاعر کا نام بھی محبوب کے حوالے اور کلام بھی۔شاعر اپنی انتہائی ذاتی اور محبوب چیزیں محبوب کو دان کر دیتا ہے۔ شاید رات کے وقت شاعر اپنے شعروں کو صوتی جامہ اس لیے بھی پہنانے سے قاصر ہے کہ یہ تو محبوب کے لیے ہیں سو اسی تک جایا جائے، کیا خبر رات کا سفر طے کر کے منزل کا نشاں مل ہی جائے۔۔ شاعر اس منزل کا پتا دوسرے مصرعہ میں "تری گلی" کے الفاظ سے دیتا ہے۔ یونہی گونگے رستے پہ چلتا شاعر کوچہِ جاناں تک جا پہنچتا ہے لیکن اس کے بعد اس کا کچھ نشاں نہیں ملتا۔اسے محبوب کی گلی تک تو دیکھا گیا لیکن خانہِ یار میں جا بیٹھنا اسے نصیب ہوا یا کہ سفر کی صعوبت اسے لے ڈوبی، کچھ پتا نہیں۔

3.3۔ غزل:3

میں نے جب لکھنا سیکھا تھا
پہلے تیرا نام لکھا تھا
میں وہ صبرِ صمیم ہوں جس نے
بارِ امانت سر پہ لیا تھا
میں وہ اسمِ عظیم ہوں جس کو
جن و ملک نے سجدہ کیا تھا
تو نے کیوں مرا ہاتھ نہ پکڑا
میں جب رستے سے بھٹکا تھا
پہلی بارش بھیجنے والے
میں ترے درشن کا پیاسا تھا

شعر:1

میں نے جب لکھنا سیکھا تھا
پہلے تیرا نام لکھا تھا

ناصر کی یہ غزل انسان اور رب کے تعلق کا بیان ہے۔ناصر نیا س غزل میں ربوبیت اور نیابت کے معاملات

بیان کیے ہیں۔ مکمل غزل کے تناظر میں دیکھیں تو پہلے شعر میں شاعر اپنے زورِ قلم کی ابتدا رب کے نام سے کرتا ہے۔ شاعر جب اول اول لکھنا سیکھتا ہے تو وہ رب کا نام لکھتا ہے جو اس کی خدا سے محبت اور تعلق کا اظہار ہے۔ یہ ایک فطری سی بات ہے کہ جب انسان کوئی فن سیکھتا ہے تو اپنے فن کا مظاہرہ سب سے پہلے اپنے محبوب کے لیے کرتا ہے، مصور محبوب کی تصویر بنا کر تسکین پاتا ہے، شاعر محبوب کی مدح لکھ کر قرار پاتا ہے، بالکل ایسے ہی رب کا تخلیق کردہ انسان یعنی شاعر جب لکھنے کے فن سے آشنا ہوتا ہے تو سب سے پہلے رب کا نام لکھتا ہے یہاں لکھنے سے مراد ہجے، کتابت یا خطاطی نہیں بلکہ اس فہم اور شعور کی طرف اشارہ ہے جو تحریر سے وابستہ ہے۔ یعنی جب شاعر نے شعور کے ساتھ لکھنا شروع کیا تو ربِ کریم اس کا اولین محبوب موضوع ٹھہرا اور باقی سب موضوعات اس موضوع کے بعد آتے ہیں۔ یہ شاعر کی رب سے محبت اور عقیدت کا اظہار ہے، یہ شاعر کے عجز و انکسار کی نشانی ہے، یہ شاعر کی بندگی کا ایک انوکھا اور خوبصورت انداز ہے کہ وہ اپنے فن کو فن عطا کرنے والے کے نام معنون کرتا ہے۔

شعر:2

میں وہ صبر صمیم ہوں جس نے
بار امانت سر پہ لیا تھا

صمیم: پختہ، بلند

اس شعر میں شاعر انسان اور رب کے اس تعلق کی بات کر رہا ہے جس کے طفیل انسان کو نیابت کا تحفہ ملا۔ انسان نائب خدا ہے اور پوری دنیا میں کوئی اور مخلوق ایسی نہیں کہ جو نیابت کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھانے کا اہل ہو، سوائے حضرتِ انسان کے۔ قرآنِ مجید میں آتا ہے:

''اور ہم نے آسمانوں زمین اور پہاڑوں کو اپنی امانت دکھائی اسے کسی نے قبول نہ کیا کہ اٹھائے اور ڈر گئے جب کہ انسان نے اس کو اٹھا لیا بے شک یہ بڑا ظالم اور نادان ہے۔'' (سورہ احزاب آیت ۷۲)

یعنی اللہ نے پکارا کہ ہے کوئی جو اس کی ایک امانت کا بوجھ اٹھائے؟ یہ آواز سن کر سمندر کی سانسیں ٹوٹنے لگیں۔ پہاڑ ہیبت سے لرز اٹھے۔ پوری کائنات پر لرزہ طاری ہو گیا۔ کسی میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ یہ بوجھ اٹھانے کی حامی بھر لیتا۔ پھر اللہ نے وہ امانت انسان کو سونپ دی۔ اور انسان اسے اٹھائے عالمِ اضطراب میں سرگرداں ہے۔ یہ بوجھ تو ربِ کریم کا عطا کردہ ہے، پھر یہ اضطراب کیوں؟ اضطراب اس لیے کہ نیابت فقط منصب نہیں ایک فرض ہے اور اس فرض کا تقاضا ہے کہ خدا کا نائب ہونے کے ناطے انسان اپنی سطح پر اپنے اندر اوصافِ ربی پیدا کرے، وہ دوسرے انسانوں کے ساتھ نرمی کرے، رحم کرے، مہربانی کرے، درگزر کرے، معاون ہو، عادل ہو، منصف ہو اور یہ تمام اوصاف انسان سے ریاضت طلب کرتے

ہیں اور ریاضت کارِگراں ہے۔اگر انسان نیابت کے تقاضے پورے نہیں کر پا تا تو اضطراب از خود اس کی شخصیت میں در آ تا ہے۔۔دوسری جانب اگر انسان نیابت کے تقاضوں سے سرے سے بے بہرہ ہے، اسے سمجھ ہی نہیں کہ اس کی تخلیق کا مقصد کیا ہے تو منزل کا عدم تعین اس کے اندر اضطراب پیدا کر دیتا ہے۔ ہر دو صورتوں میں انسان مضطرب ہے، اضطراب کی کیفیات و محرکات البتہ الگ ہیں۔سو نیابت اوپر والے کی امانت ہے اور اس امانت کی حفاظت انسان سے صبر کی متقاضی ہے۔ یہ کائنات کا سب سے بڑا صبر ہے۔نیابت کے جس بوجھ کو فرشتے بھی اٹھانے کے اہل نہ تھے، وہ بوجھ انسان اپنے کندھوں پہ اٹھالایا۔بقول میر:

سب پہ جس بار نے گرانی کی
اس کو یہ ناتواں اٹھا لایا

شعر:3

میں وہ اسم عظیم ہوں جس کو
جن و ملک نے سجدہ کیا تھا

اسمِ عظیم: عظمت والا نام

س شعر میں شاعر اس واقعے کی طرف اشارہ کرر ہا ہے کہ جب اللہ کے حکم سے فرشتوں اور جنات نے انسان کو سجدہ کیا تھا۔ شاعر تمام انسانوں کی نمائندگی کرتے ہوئے کہہ رہا ہے کہ انسان کی ذات کو ہی اللہ تعالی نے وہ مرتبہ بخشا ہے کہ باقی مخلوقات نے اس کے آگے سر جھکا دیا۔ اللہ تعالی نے انسان کو دنیا میں اپنا نائب بنا کر بھیجا ہے اور اسے تمام مخلوقات پر فوقیت دی ہے۔انسان کے علاوہ دیگر کسی مخلوق میں یہ خصوصیت نہیں تھی کہ وہ خدا کی نیابت کے فرائض سرانجام دے سکے، اسی لیے انسان کو دیگر مخلوقات پر فضیلت حاصل ہے۔شاعر اس شعر میں انسان کی اسی آفاقی نوعیت کا اظہار کرر ہا ہے۔

اللہ نے انسان کو نیابت کی جو امانت سونپی وہ امانت اللکی تمام صفات کا پرتو ہے، یعنی اس منصب میں صفاتِ ربانی کا ہلکا سا عکس شامل ہے۔اللہ نے اپنی تمام صفات انسان کو سونپ دیں اور انسان کی تقویمِ حسنہ کے بعد فرشتوں کو سجدے کا حکم ہوا۔سورہ بقرہ کے مطابق:

"اور یاد کرو جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے" (۴۳)

شعر:4

تو نے کیوں مرا ہاتھ نہ پکڑا
میں جب رستے سے بھٹکا تھا

اس شعر میں شاعر انسان کے جنت سے خروج اور زمین پر آمد کے واقعہ کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ آدم وحوا ابلیس کے بہکاوے میں آ کر اپنے رب کی نافرمانی کر ڈالی۔ یہاں شاعر گنہگار کی آواز بن کر رب سے کہتا ہے کہ انسان تو کم فہم و نادان ہے لیکن رب تو معاملوں کو جاننے والا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ وہ غلط رستے پر پڑتے انسان کے قدموں کو روک لے۔ گناہ کے کنوئیں میں گرتے ہوئے نسان کو ہاتھ پکڑ کر زندگی کی طرف واپس کھینچ لے۔ شاعر کے انداز میں شکوہ سا ہے اور یہ شکوہ اس کے اور رب کے تعلق میں موجود قربت کو ظاہر کر رہا ہے کیونکہ شکوہ بھی انسان وہیں کرتا ہے جہاں اسے شنید کی امید ہو۔

شعر:5

پہلی بارش بھیجنے والے
میں ترے درشن کا پیاسا تھا

درشن: دیدار

پچھلے اشعار کو مدِ نظر رکھا جائے تو یہاں پہلی بارش وہ پہلا کرم ہے جو انسان کی ذات پر توبہ کی قبولیت کی صورت میں کیا گیا۔ انسان جب گناہ کرتا ہے تو گناہ کی آگ اس کا تن من جلا دیتی ہے اور جب وہ توبہ کرتا ہے، اس کی توبہ قبول ہوتی ہے تو اسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس کے جلتے وجود کو کرم کی بارش نے ٹھنڈک بخش دی ہے۔ شاعر اس بارش کے برسانے والے کی دید کا متمنی ہے اور انسان میں اس دید کی خواہش آدم سے سفر کرتی ہوئی موسیٰ تک آ پہنچتی ہے حتیٰ کہ بارش برسانے والا اپنی تجلی دکھاتا ہے اور یہاں انسان کی سکت اتنی نہیں رہتی کہ وہ اس جلوے کو سہار سکے اور یوں دید کی لگن مسلسل سفر کرتی ہوئی شاعر کے دل میں جگہ پا لیتی ہے۔ یہاں شاعر اسی معصوم لگن کا اظہار کرتا ہے کہ جس کی بابت وہ سب جانتا ہے مگر پھر بھی آتشِ شوق سوال بن کر اس کے لبوں پر آ جاتی ہے۔

3.4۔ غزل:4

گلی گلی آباد تھی جن سے کہاں گئے وہ لوگ
دلی اب کے ایسی اجڑی گھر گھر پھیلا سوگ
سارا سارا دن گلیوں میں پھرتے ہیں بے کار
راتوں کو اٹھ اٹھ کر روتے ہیں اس نگری کے لوگ
سہمے سہمے سے بیٹھے ہیں راگی اور فن کار
بھور بھئے اب ان گلیوں میں کون سنائے جوگ

جب تک ہم مصروف رہے یہ دنیا تھی سنسان
دن ڈھلتے ہی دھیان میں آئے کیسے کیسے لوگ
ناصر ہم کو رات ملا تھا تنہا اور اداس
وہی پرانی باتیں اس کی وہی پرانا روگ

شعر:1

گلی گلی آباد تھی جن سے کہاں گئے وہ لوگ
دلی اب کے ایسی اجڑی گھر گھر پھیلا سوگ

سوگ: ماتم، غم، اندوہ

ناصر کی یہ غزل مسلسل مفاہیم کی حامل ہے۔ تمام اشعار ہجرت کے نوحہ خواں ہیں۔ ہر طرف تباہی و بربادی کی تصویریں ملتی ہیں۔ شاعر گلیوں کو رونق بخشنے والے لوگ ڈھونڈتا پھر رہا ہے کہ جنہیں آزادی کی خواہش نے برباد کر دیا۔ کیا دن تھے کہ جب یہی لوگ یہاں وہاں چہلیں کرتے پھرتے تھے، مزاج موافق محفلیں سجتی تھیں، الفتِ باہمی اس قدر تھی کہ دوسراہٹ کا احساس تک نہ تھا۔ لیکن پھر آزادی، الگ شناخت، بقا سے ہوتے ہوتے بات جغرافیائی تقسیم تک آ پہنچی تو منظر بدل گیا۔ اب کی بار جنگ ایسی کارگر ثابت ہوئی کہ ہر بستی اجڑ گئی۔ شعر میں "دلی" کا ایک بار پھر اجڑ نا فی الوقت اجاڑ کے ساتھ ساتھ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کا منظر بھی یاد دلانے لگتا ہے۔ "دلی" اجڑے شہر کی علامت ہے۔ سن ۵۷ء کی بغاوت کے نتیجے میں انگریزوں نے دلی یوں لوٹی جیسے کسی دلہن کے گہنے نوچ، لباس تار اس کی عزت پامال کر دی گئی ہو، اس کا سہاگ، اس کا شباب چھین لیا گیا ہو۔ اب کی بار یہ سانحہ پہلے سے زیادہ دردناک ہے۔ تقسیمِ ہند میں اونچے برجوں والے شہروں سے لے کر چھوٹے چھوٹے گاؤں تک، قدیم تہذیب کے گہواروں سے لے کر نئی رسموں کے امین شہر تک۔۔ سب ہجرت کی چکی میں پس گئے۔ کوئی کہاں تو کوئی کہاں جا بسا۔ تقسیمِ ہند صرف زمین کا بٹوارا نہ تھا بلکہ یہ جسموں اور ذہنوں کا بٹوارا بھی تھا۔ مہاجر آدھے جسم آدھے ذہین کے ساتھ ہجرت زدہ ماحول میں باقی حیات کرنے پہ مجبور ہو گئے۔ شاعر نے ان آدھے ادھورے لوگوں اور لٹے پٹے شہروں کی تکلیف کو احساس کی آنکھ سے دیکھا اور جذبات کی قلم سے تحریر کیا ہے۔

شعر:2

سارا سارا دن گلیوں میں پھرتے ہیں بے کار
راتوں کو اٹھ اٹھ کر روتے ہیں اس نگری کے لوگ

ہجرت کے حادثہ سے پہلے کار ہائے جہاں معمول کے مطابق چل رہے تھے لیکن بعد از اں سب معمولات بگڑ

گئے۔ کاروبار ٹھپ ہو گئے، کام ختم ہو گئے، رابطے ٹوٹ گئے، رشتے بچھڑ گئے، لوگ مر گئے، گھر گر گئے، شہر سنسان، گلیاں ویران ہو گئیں۔ ایسے میں کرنے کو کچھ بھی نہ بچا، حتیٰ کہ کارِ الفت بھی نہ رہا۔ برباد گلیوں میں دن بھر لوگ بغیر کسی مصرف کے پھرتے رہتے، رات کو سکون سے سونے کی بجائے اٹھ بیٹھتے اور شہر کی حالتِ زار دیکھ کر خود بھی زار و قطار رونا شروع کر دیتے۔ آنسو انسان کی بے بسی کی انتہا کا مظہر ہیں۔ جب کچھ نہیں بن پاتا تب آنسو بنتے ہیں۔ جب درد برداشت سے سوا ہو جاتا ہے تب آنسو بہتے ہیں۔ جب بچھڑے لوگ اور اجڑا ہوا منظر آنکھ کی قیود پھلانگتا دل میں آن ٹھہرتا ہے تب احساس اشک بن جاتے ہیں۔ شاعر نے بھی وحشت زدہ ماحول کے متاثرین کی ایسی ہی تصویر پیش کی ہے کہ جس میں لوگ کچھ نہیں کر رہے، بس رو رہے ہیں، سوائے رونے کے ان کے پاس کچھ کرنے کو ہے ہی نہیں۔ دن بھر بے کار پھرنے کے بعد رات کا تاریکی ان کی زندگی میں در آنے والے اندھیرے کے احساس کو مزید بڑھا دیتی ہے اور وہ سیاہ بختی کی مجسم تصویر بنے دکھائی دیتے ہیں۔

شعر:3

سہمے سہمے سے بیٹھے ہیں راگی اور فن کار
بھور بھئے اب ان گلیوں میں کون سنائے جوگ

بھور بھئے: صبح سویرے

جوگ: ایک راگ کا نام

یہ شعر بھی درج بالا اشعار کی طرح تقسیم ہند کے بعد پیش آنے والی صورت حال کی عکاسی کرتا ہے۔ وہ شہر جو کبھی راگ راگنیوں کی سریلی آوازوں سے آباد تھے، جہاں سازندے اور راگی اپنے فن پر نازاں تھے، فن کار اپنے اپنے فن کے شعبدے دکھا کر اپنے فن کی داد وصول کرتے تھے۔۔ ہجرت کے بعد وہاں کا منظر ہی بدل چکا ہے۔ یہ راگی، یہ فن کار جو کل بڑھ بڑھ کر اپنے فن کے کمالات دکھاتے تھے اب ڈرے سہمے بیٹھے ہیں۔ صبح سویرے جوگ کی آوازیں آنا بند ہو گئی ہیں۔ ہر طرف ویرانی اور بربادی نے ڈیرہ ڈال رکھا ہے سو ایسے میں فن کی آبادی کی کوئی صورت ہی نہیں بنتی اور سازندوں کے لیے ساز اپنے معنی کھو دیتے ہیں۔

شعر:4

جب تک ہم مصروف رہے یہ دنیا تھی سنسان
دن ڈھلتے ہی دھیان میں آئے کیسے کیسے لوگ

سنسان: ویران

شاعر دن بھر کارِ دنیا میں مصروف رہتا ہے لیکن اسے دنیا میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی بلکہ اس کے نزدیک دن کی دنیا سنسان و ویران ہے۔ دن بھر ہر طرف شور اور ہنگامہ آرائی کے باوجود شاعر کے لیے اس دنیا میں دلچسپی کا کوئی پہلو نہیں۔ دن کی روشنی سے شاعر کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں کیونکہ وہ دن کی بجائے رات کا ناظر ہے۔ وہ دن بھر سنسان بستی میں کارِ

ضیاع سرانجام دینے کے بعد جب رات کی وادی میں قدم رکھتا ہے تو اس کیخیال میں وہ صورتیں مجسم آن ٹھہرتی ہیں کہ دن میں جن کی طرف دھیان تک نہیں جاتا۔ یہ صورتیں شاعر کی تنہائی کی ساتھی ہیں۔ رات کے وقت اس کا خانہ خیال طرح طرح کے محبوب چہروں سے سج جاتا ہے۔ وہ ان صورتوں، ان چہروں سے لفظوں کی مورتیاں تراشتا ہے۔ یہ یادیں اور یہ خیال شعر کا روپ دھارنے لگتے ہیں۔ شاعر کی ذات ایک سیپ کی مانند ہے، جس میں تخلیق کے جواہر چھپے ہیں۔ رات کی تاریکی میں چاند کی روشنی سے اس سیپ کا منہ کھلتا ہے اور خیال کے موتی شہ پاروں میں ڈھل جاتے ہیں۔ گویا شاعر کے لیے رات دن سے زیادہ آباد ہے کہ جس میں وہ تخلیق کے کیف آگیں کرب سے گزرتا ہے۔

شعر:5

ناصر ہم کو رات ملا تھا تنہا اور اداس
وہی پرانی باتیں اس کی وہی پرانا روگ

روگ: آزار، تکلیف

رات، تنہائی اور اداسی ناصر کی جا گیرِ خاص ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ زندگی نے یہ تین تحفے شاعر کو بطور خاص عطا کیے ہیں یا پھر شاعر نے ازخود زندگی سے یہی تحفے مانگے ہیں۔ ماضی کی آواز شاعر کے ہر حال میں شامل ہے۔ انبالہ کی یادیں شاعر کے ہر خیال کی صورت گر ہیں اور یہ یادیں الفاظ بن کر، آواز بن کر کو بہ کو پھیلی ہیں۔ شاعر ماضی کے سمندر میں غوطہ زن ہے، عرصے بعد بھی اس کی باتوں میں کوئی نیا پن نہیں بلکہ پرانے وقتوں کی جھلک ہی ملتی ہے۔ اس کے غم، دکھ، روگ سب پرانا ہے۔ گویا شاعر کا جسم زمانی اعتبار سے زندگی بسر کر رہا ہے لیکن اس کی سوچ، خیال، دھیان، جذبات، احساسات منجمد ہو چکے ہیں، اس کے ہاں کوئی نیا دکھ کوئی، نیا درد جگہ نہیں پاتا۔ یا شاید پرانا دکھ اور پرانا زخم اتنا کاری ہے کہ وہ ہر نئے درد کو کھا جاتا ہے۔ بہر دوصورت شاعر اذیت، دکھ، تکلیف، روگ ایسی کیفیات کا مرقع ہے۔

3.5۔ غزل:5

یہ شب یہ خیال و خواب تیرے
کیا پھول کھلے ہیں منہ اندھیرے
دیتے ہیں سراغ فصل گل کا
شاخوں پہ جلے ہوئے بسیرے
جنگل میں ہوئی ہے شام ہم کو
بستی سے چلے تھے منہ اندھیرے

منزل نہ ملی تو قافلوں نے
رستے میں جما لیے ہیں ڈیرے
روداد سفر نہ چھیڑ ناصر
پھر اشک نہ تھم سکیں گے میرے

شعر:1

یہ شب یہ خیال و خواب تیرے
کیا پھول کھلے ہیں منہ اندھیرے

ناصر کی زندگی میں رات کے وقت کا خصوصی مقام ہے۔ رات ہوتے ہی شاعر کو محبوب کے خیال اور خواب نے آن گھیرا ہے۔ کچھ تو رات بذاتِ خود شاعر کے سوز میں اضافے کا باعث ہے اس پہ محبوب کا خیال اور بھی کاری ثابت ہوتا ہے۔ شاعر تمام رات انہی خوابوں اور خیالوں میں بسر کر دیتا ہے یہاں تک کہ صبح کا وقت قریب آنے لگتا ہے۔ ایسے میں محبوب کا خیال رات کی چادر سے نکل کر سحر کی کیاریوں میں پھول بن کر مہک اٹھتا ہے اور یوں شاعر کے لیے ان خواب و خیال سے مزین ایک مہکتے دن کا اہتمام ملتا ہے۔ یہ دن بھی دراصل اسی رات کی عطا ہے کہ جو شاعر نے محبوب کی یادوں کے ساتھ بسر کی ہے۔

شعر:2

دیتے ہیں سراغ فصل گل کا
شاخوں پہ جلے ہوئے بسیرے

بسیرا: ٹھکانا

سوال یہ ہے کہ شاعر نے بہار کی آمد کا تذکرہ گلوں کی کھلنے اور پھولوں کے مہکنے سے کیوں نہ کیا؟ شاخوں سے جلے ہوئے بسیروں پر ہی کیوں اس کی نظر ٹھہری؟ شاعر یہاں تقسیمِ ہند میں مٹ جانے والے ان گھروندوں کی جانب اشارہ کر رہا ہے جو استعمار کی تخریب کا نشانہ بنے۔ فصلِ گل سے مراد آزادی سے وابستہ وہ بہاریں ہیں جن کا خواب لے کر مسافر اپنے گھر چھوڑ چلے تھے لیکن سفر کے اختتام پر معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خوابوں کی تعبیر ہنوز دور ہے۔ شاعر وہیں ان جلے ہوئے ٹوٹے پھوٹے گھروں میں قید ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کا جسم سفر کر کے، ہجرت کر کے آزاد ہو گیا ہے لیکن اس کی روح، اس کی سوچ، اس کا خیال ابھی تک انہیں جل بجھے مکانوں کا مکین ہے۔

شعر:3

جنگل میں ہوئی ہے شام ہم کو
بستی سے چلے تھے منہ اندھیرے

شاعر کا سفر ہے کہ ختم ہونے کو نام ہی نہیں لے رہا۔ وہ منہ اندھیرے اپنی بستی سے عازمِ سفر ہوا تھا اور شام ہونے کو

آئی لیکن وہ منزل پر نہ پہنچ سکا۔ اب پھر اندھیرا ہونے کو ہے اور وہ جنگل میں آن پہنچا ہے جہاں سے نہ تو وہ بستی واپس جا سکتا ہے اور نہ ہی ابھی اسے منزل ملی ہے۔ دراصل شاعر اپنی منزل سے بے خبر ہے۔ یہاں بستی سے شروع ہونے والا سفر اس کی زندگی کا آغاز ہے اور جنگل اس کی زندگی کے اواخر کی جانب ایک اشارہ ہے۔ تمام عمر ایک سفر میں گزارنے کے بعد، کڑی دھوپ، بدلتے موسم، زندگی کی رنگینیاں دیکھنے کے بعد اب اس کے ہاں فقط شام آٹھہری ہے۔ خاموش اور اداس شام، جنگل کا مقام، جہاں کوئی دوست نہیں کوئی ساتھی نہیں۔ شاعر اکیلا ہے، تنہا ہے، ہر طرف بس وہ خود ہی ہے۔ ایسے میں دفعتاً اسے سفر کے اوائل اوقات یاد آ جاتے ہیں لیکن اس یاد سے کچھ بن نہیں پڑتا کہ اب اس جنگل میں ہی اسے تنہا رات بسر کرنی ہے۔ شاعر کی کہانی ہر انسان کی کہانی ہے، ہر انسان یونہی دن چڑھے سفر شروع کرتا ہے اور شام کسی ویرانے، کسی گورستان میں ہو جاتی ہے جہاں رات سب نے تن تنہا گزارنی ہے، کوئی ساتھی نہیں، کوئی پرسانِ حال نہیں۔ اس شعر میں انسان کی زندگی کے آغاز اور انجام یعنی پیدائش سے لے کر موت تک کے سفر کی جانب اشارہ ملتا ہے۔ پھر ناصر کے ذاتی تجربات کی روشنی میں دیکھا جائے تو ہجرت اور تقسیم کا سفر بھی متصور کیا جا سکتا ہے کہ کچھ لوگ تقسیم کے اوائل ہنگاموں کے دوران ہی ہجرت کا فیصلہ کر چکے تھے اور ایک نئی منزل کا خواب آنکھوں میں سجائے ایک بستی، بسی بسائی جگہ کو چھوڑ کر ایک اجنبی مقام کے لیے عازمِ سفر ہوئے۔ بعد از سفر وحضر ان پہ کھلا کہ وہ تو کسی غیر آباد جنگل نما مقام پہ آن ٹھہرے ہیں جہاں ان کی آرزوؤں اور خواہشوں کا خاتمہ یوں ہوتا ہے کہ شکست خواب اور شکست ذات ہی ان کا مقدر ٹھہرتی ہے۔ ہر دو امکانات کی روشنی میں دیکھا جائے تو شعر میں انسان کی زندگی کی مسلسل فعالیت اور آبادی سے لے کر خاموشی، چپ، جمود اور سکوت تک کے سفر کا بیان ملتا ہے۔ جنگل کی شام سکون وسکوت کی علامت ہے۔

شعر:4

منزل نہ ملی تو قافلوں نے
رستے میں جما لیے ہیں ڈیرے

مسافروں کے لیے منزل حاصلِ سفر ہوتی ہے اور منزل کا تعین سفر سے پہلے ہی کر لیا جاتا ہے۔ لیکن بعض اوقات منزلیں بے نشاں ہو جاتی ہیں۔ ایک بے سمت راستے کے راہی تمام عمر بھی چلتے رہیں تب بھی سفر کا حاصل تھکن اور مشقتِ محض ہی ٹھہرتا ہے۔ جب سفر کی صعوبت بے سود ہو تو وہ کارِ بے کار کے سوا کوئی معنی نہیں رکھتی اس لیے ایسے میں قافلے تھک ہار کر منزل سے قبل ہی ڈیرہ ڈال لیتے ہیں۔ اس شعر میں بھی شاعر کارواں کی بے بسی کی تصویر کھینچتا ہے کہ ہزار چاہ کر بھی منزل نگاہ سے یوں اوجھل ہوتی ہے جیسے کہ مسافر کا سفر منزل کے لیے ہو ہی نہیں۔

شعر:5

روداد سفر نہ چھیڑ ناصر
پھر اشک نہ تھم سکیں گے میرے

روداد: قصہ، کہانی

اشک: آنسو

شاعر کو محبت کے سفر میں رنج والم کا اس طرح سامنا رہا ہے کہ اس کا تمام سفر دکھ درد پہ محیط نظر آتا ہے۔ وہ اس پر درد سفر کے واقعات کو سینے میں دفن کیے ہوئے ہے۔ اس میں اتنا حوصلہ نہیں کہ وہ اپنے سفر کی دکھ بھری داستان کسی کے گوش گزار کر سکے۔ اسے خدشہ ہے کہ اگر وہ سفر کی روداد چھیڑ بیٹھا تو پھر وہ اپنے آنسوؤں کو روک نہ پائے گا۔ وہ اپنے اس سفر کی صعوبتوں سے خوب واقف ہے جبھی تو وہ اس ذکر سے گریزاں ہے۔ پھر ناصر کی ذات کو مدِ نظر رکھیں تو یہ بات واضح ہے کہ ان کی زندگی کا سفر ہجرت سے ہجر تک پھیلا ہوا ہے۔ ناصر نے تقسیمِ ہند کے سفر کو صرف آنکھوں سے دیکھا ہی نہیں بلکہ شدت سے محسوس بھی کیا ہے۔ اس سفر کی یادیں ناصر کے شعر میں اشک بن کر شامل نظر آتی ہیں۔ شاعر میں اتنا یارا نہیں کہ وہ اپنے اس سفر کی روداد کسی کو سنانے کا متحمل ہو سکے۔ وہ جب بھی کہانی سنانے کی کوشش کرتا ہے اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ہیں سو وہ یہی بہتر سمجھتا ہے کہ اس بابت کوئی بات ہی نہ کرے۔

4۔ خود آزمائی

1۔ ناصر کاظمی نے اردو غزل کو جن موضوعات سے آشنا کیا۔ان پر روشنی ڈالیے۔

2۔ ناصر کی غزل میں اپنے عہد کی ویرانی وانتشار کے مناظر بہت نمایاں ہیں۔آپ کے خیال میں اس کی کیا وجوہات ہیں۔

3۔ ناصر کے کلام میں اداسی کا سبب دراصل ان کا احساس تنہائی کا عطا کردہ ہے۔دلائل کے ساتھ بحث کیجیے۔

4۔ ناصر کی شاعری ایک پختہ تہذیبی روایت میں پلے ہوئے مزاج کی عکاسی دکھائی دیتی ہے۔آپ کی کیا رائے ہے۔

5۔ ناصر کاظمی کی غزل کی نمایاں خصوصیات سے بحث کیجیے۔

6۔ ناصر کاظمی کی شاعری دراصل کھوئے ہوؤں کی جستجو کا منظر نامہ ہے۔اظہار خیال فرمائیے۔

5۔ مجوزہ کتب برائے مطالعہ:

1۔ ناصر کاظمی،کلیات ناصر کاظمی،فضل حق اینڈ سنز،لاہور،1992ء

2۔ احمد مشتاق (مرتب)،ہجر کی رات کا ستارہ،مکتبہ نیا ادارہ،لاہور،1976ء

3۔ حامدی کاشمیری،ناصر کاظمی کی شاعری،اردو رائٹرس گلڈ،الہ آباد،1982ء

4۔ ڈاکٹر حسن رضوی،وہ تیرا شاعر وہ تیرا ناصر،سنگ میل پبلشرز،لاہور،1996ء

5۔ انور سجاد (مرتب)،رات کے مسافر،مکتبہ جامعہ،نئی دہلی،2001ء

6۔ ڈاکٹر ناہید قاسمی،ناصر کاظمی شخصیت اور فن،فضل حق اینڈ سنز،لاہور،1990ء